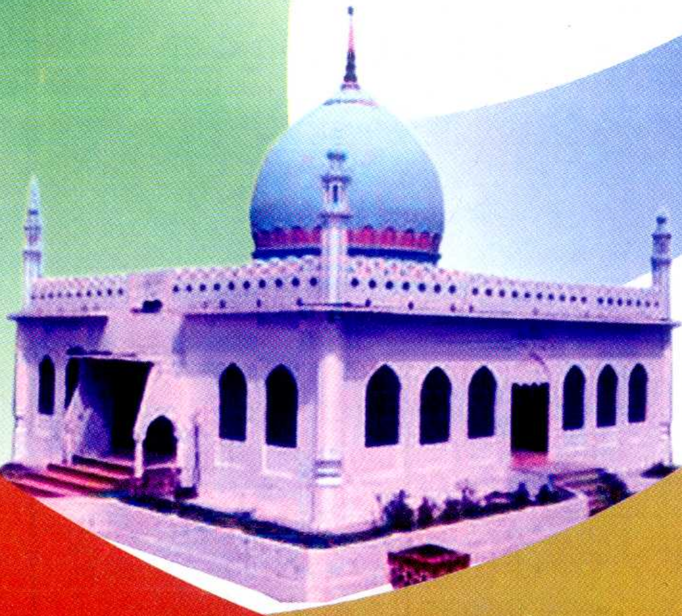
الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی وعلمی ترجمان

ماہنامہ

# اشرفیہ

مبارکپور

جون 2010



مبارک حسین مصباحی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبد العزیز قدس سرہ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

# ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور

زیرِ سرپرستی

عزیز ملت حضرت علامہ شاہ الحاج عبد الحفیظ صاحب قبلہ

سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

جلد نمبر ۳۴ شمارہ ۶

جون ۲۰۱۰ء

جمادی الاخریٰ ۱۴۳۱ھ



| | | |
|---|---|---|
| **ترسیل زر و مراسلت کا پتہ**<br>دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور<br>اعظم گڑھ یو۔پی۔ ۲۷۶۴۰۴ | **THE ASHRAFIA MONTHLY**<br>Mubarakpur. Azamgarh<br>(U.P.) India. 276404 | قیمت عام شمارہ: 15 روپے<br>سالانہ: 150 روپے |
| **چیک اور ڈرافٹ**<br>بنام<br>**مدرسہ اشرفیہ**<br>بنوائیں | کوڈ نمبر —— 05462<br>دفتر ماہنامہ اشرفیہ —— 250149<br>الجامعۃ الاشرفیہ —— 250092<br>دفتر اشرفیہ ممبئی فون/فیکس 23726122 | سری لنکا، بنگلا دیش، پاکستان، سالانہ<br>500 روپے<br>دیگر بیرونی ممالک<br>$ 20 امریکی ڈالر £ 15 پونڈ |

**نوٹ:** آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail: info@aljamiatulashrafia.org

مولانا محمد ادریس مصباحی نے نشاط آفسیٹ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

# نقوشِ قلم





اداریہ

# کیاموجودہ دور اسلام کی موافقت میں ہے؟


مبارک حسین مصباحی


**اسلام** کے لیے امکانات وخطرات ہر دور میں رہے ہیں، لیکن فروغِ اسلام کے لیے جتنے امکانات عہدِ حاضر میں ہیں، ماضی میں کبھی نہیں رہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج اسلام کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں، دہشت گردی کے حوالے سے مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، مگر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے، کیا یہ سراسر کذب وبہتان ہے یا اس کے پیچھے کوئی سچائی بھی ہے۔ آج طالبان جس اسلام کو پیش کر رہے ہیں کیا واقعی اسلام ہے۔ کیا ان کا طریق عمل اسلامی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ بڑی اچھی بات ہے لیکن کیا ڈنڈے کے زور پر نمازیں پڑھوانا، روزہ رکھوانا، داڑھی رکھوانا، دلوں کو بدل سکتا ہے؟ پردے کے اہتمام کے لیے سرعام نوجوان لڑکیوں کو پیٹنا کہاں کا اسلام ہے۔ جو انقلاب دلوں کے اطمینان کے بعد آتا ہے دیرپا اور خیر افزا ہوتا ہے۔ اور جو انقلاب طاقت اور جبر وتشدد کی وجہ سے برپا ہوتا ہے وہ اسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک طاقت اور جبر وتشدد کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اسلام سراپا رحمت ومحبت ہے۔ حقیقی اسلام کی بنیادیں خلقِ عظیم اور نرم خوئی کی زمین پر اٹھائی گئی ہیں۔

صدیوں کے دامن پر پھیلا ہوا صوفیاے کرام کی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ آج بھی تاریخ کی ناقابلِ تردید سچائی ہے۔ نہ تلوار اٹھائی اور نہ خود کش حملے کیے اور اسلام دلوں کی سرزمین پر اترتا چلا گیا۔ کفرستان ہند میں اسلام کی بہاریں صوفیاے کرام کے کردار واخلاق ہی کا نتیجہ ہیں۔ صرف سلطان الہند خواجہ غریب نواز نے نوّے لاکھ کافروں کو داخلِ اسلام کیا مگر ان کے دامنِ حیات پر تشدد اور دہشت گردی کا کوئی داغ نہیں، بلکہ صوفیاے اسلام نے عین اسلام مخالف دور میں محبت اور یک جہتی کو فروغ دیا۔ اولیاے کرام کے مزارات آج بھی یک جہتی اور امن و شانتی کے گہوارے ہیں۔ خانقاہوں میں آج بھی بلا تفریق مذہب وملت لوگ عقیدتوں کے نذرانے لے کر حاضر ہوتے ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے:"الاھلک المنتطعون."(صحیح مسلم)۔ خبردار! بے جا تشدد کرنے والے ہلاک ہوگئے۔ تین بار ارشاد فرمایا۔ اسی طرح آپ دیکھیں، طالبان نے انگریزی اسکولوں کو ڈھادیا، بچیوں کی تعلیم پر پابندی عائد کردی۔ یہ اسلام نہیں بلکہ اسلام کو ایک دقیانوسی مذہب کے طور پر پیش کرنے کی ناکام تحریک ہے۔

اسلام میں تشدد اور دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں اور خودکش حملے تو سراسر اسلام وشریعت کے خلاف ہیں، طالبان جنت کا لالچ دے کر سادہ لوح نوجوانوں کو دہشت گردی اور خودکش حملوں کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ جنت کا نہیں جہنم کا راستہ ہے۔ غیب داں پیغمبر رحمتِ عالم ﷺ نے اس فکر وعمل کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ حدیثِ بخاری کی رو سے جنت کے حصول کے لالچ میں قتل وغارت گری کرنے والے خودکش بمبار جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکیں گے بلکہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

عقائد ونظریات میں بھی طالبانی مذہب اسلام کے حقیقی تصور سے مختلف ہے، جیسے اولیا اور انبیا سے استمداد واستعانت، مزارات پر جانا، ایصالِ ثواب کرنا، محفل میلاد منعقد کرنا وغیرہ امور جو قرآن وحدیث اور تاریخ اسلام کے مسلمات سے ہیں، انھیں شرک وبدعت کہتے ہیں، اسی کی پاداش میں کتنے علماے حق اور مشائخ اسلام کو شہید کیا اور اولیاے کرام کے مزارات کو ڈھایا گیا اور انھیں نقصان پہنچایا گیا۔ حسب ذیل مزارات کی تفصیل تو ہندوستانی اخبارات نے بھی شائع کی تھی۔

(۱) بونیر میں پیر بابا کا مزار۔

(۲) پیشاور میں رحمان بابا کا مزار۔

(۳) کرزئی میں حضرت علی حسین کا مزار۔

اسی طرح کئی مزارات میں تالا لگا دیا گیا اور ان کی توہین کی گئی، حالاں کہ رسولِ کریم ﷺ نے قبروں پر بیٹھنے تک کی اجازت نہیں دی ہے، اولیاے کرام کے مزارات ہوں یا عام مسلمانوں کی قبریں ان کی تعظیم و توقیر لازم ہے۔ ارشاد مصطفیٰ ہے:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، آگ پر بیٹھنا جس سے آدمی جل جائے یہ قبر پر بیٹھنے سے بہتر ہے۔ (ابن ماجہ)

(۲) حضرت عمارہ بن حزم سے مروی ہے: "مجھے حضور نے ایک قبر پر بیٹھے دیکھا تو فرمایا: اے قبر والے، قبر سے اتر جا، نہ تو قبر والے کو تکلیف پہنچا نہ وہ تجھے۔" (الترغیب والترہیب)

مقامِ افسوس یہ ہے کہ طالبانی اسلام جو انٹرنیٹ اور دیگر الیکٹرانک ذرائع سے دنیا بھر میں مشتہر کرایا جا رہا ہے، مغربی میڈیا بھی اسی کو ہوا دے رہا ہے۔ جس سے حقیقی اسلام کی دعوت متاثر ہو رہی ہے۔ اب ان حالات میں ضروری ہو گیا ہے کہ حقیقی اسلام کی رونمائی ہو اور اس کے لیے میڈیا اور دیگر اور برق رفتار ذرائع ابلاغ کا استعمال کیا جائے۔ بلاشبہ آج اسلام کے لیے وسیع امکانات ہیں اور موجودہ سائنس اور میڈیا فروغِ اسلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ اگر ہم نے بروقت ان کا استعمال نہیں کیا تو نہ صرف یہ کہ نئی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی بلکہ ہماری فکر و دانش پر بھی ماتم کریں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نفسانیت و انانیت کے جنون سے باہر نکلنے کی توفیق خیر عطا فرمائے۔

مقامِ افسوس ہے کہ آج عالمی سطح پر بنام مسلمان نام نہاد تحریکیں بڑی تیزی کے ساتھ مسلم آبادیوں کو متاثر کر رہی ہیں اور یہ ایک زمینی سچائی ہے کہ اہل سنت کا دائرہ سمٹ رہا ہے۔ اس کی تمام ذمہ داری عہدِ حاضر کے داعیانِ اسلام کی گردن پر ہے۔ ہم ایسے وقت میں فروعی مسائل میں باہم الجھے ہوئے ہیں جب داخلی اور خارجی طور اسلام مخالف طاقتیں ہمیں آگ کی طرح نگل رہی ہیں اور فکر و عمل کی کوتاہی پر ہمیں ہماری قوم بھی کوس رہی ہے۔ یاس و قنوطیت اور منفی فکر کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جب کہ اقدام اور تعمیری فکر و عمل کا استقبال کیا جاتا ہے۔ روایتوں کا پاس ضروری ہے لیکن عصری تقاضوں سے آنکھیں موند لینا بھی حکمت و دانائی کے خلاف ہے بلکہ اپنی جہالت اور ناقابت اندیشی کا برسرِ عام اعلان کرنا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اسلام کے لیے خطرات آج بھی ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ سلسلہ عہدِ رسالت سے جاری ہے اور آئندہ بھی رہے گا، مگر ان حالات سے ہمیں مایوس نہیں بلکہ عزم و حوصلے کے ساتھ زندہ رہنا چاہیے اور فکر و عمل کی تمام توانائیوں کے ساتھ آگے بڑھنے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اسلام مخالف پروپیگنڈوں نے اسلام کے لیے حالات کافی خوشگوار بنا دیے ہیں، دلوں کی زمینیں تیار ہیں، بس دانہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ اس میں انسانیت کے تمام شعبوں کا حل ہے۔ ہماری سب سے بڑی فکری کوتاہی یہ ہے کہ جو جس شعبے میں ہے اسی کو مکمل اسلام سمجھتا ہے اور اسی شعبے کی ناکامی کو اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہے۔ کامل اسلام کی تعمیر و ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا ہر شعبہ مضبوط اور متحرک و فعال ہو جیسے مساجد و مدارس کی تعمیر و ترقی، عصری علوم کے لیے کالجز اور یونیورسٹیوں کا قیام، صحت عامہ کے لیے میڈیکل کالجز اور بڑے بڑے اسپتالوں کا قیام۔ دعوت و تبلیغ کے لیے جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال بلکہ بڑے بڑے شہروں میں میڈیا سینٹرز کا قیام، ملکی اور عالمی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی تیاری اور ترسیل، سیاسی میدانوں میں مسلمانوں کی بالادستی، اصلاحِ فکر و عمل کے لیے جگہ جگہ کنونشن اور سمیناروں کا اہتمام، جدید مسائل کے متفقہ حل کی تلاش۔ تشدد اور صلح کلیت سے مکمل اجتناب اور فکر و عمل میں باہمی محبت اور ایک دوسرے کی قدر دانی، دوسروں کی خدمات کا اعتراف اور زندگی کے ہر موڑ پر پیچھے چلنے کا حوصلہ وغیرہ وغیرہ۔

اسلام ایک آفاقی اور ہمہ گیر مذہب ہے اس لیے داعیانِ اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرے کے ہر طبقے اور فکر و عمل کے ہر صیغے کی رہ نمائی کریں۔ ۴ رفی صد طلبہ مدارس میں داخل ہوتے ہیں۔ ۹۶ رفی صد مسلم بچوں کے لیے علما کے پاس کوئی پروگرام نہیں، اسی طرح عام طور پر مدارس میں ابتدائی تعلیم کا کوئی معقول بندوبست نہیں۔ مدارس سے متعلق مکاتب بھی روایتی ادارے بن کر رہ گئے ہیں، جن میں نہ اہل ثروت اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں اور نہ خود علما اپنے بچوں کا داخل کرتے ہیں، دیگر فرقوں کے درجنوں ابتدائی نصاب ہیں جب کہ ملک بھر میں اہل سنت کا کوئی قابل ذکر باضابطہ مکمل پرائمری نصاب نہیں، اہل سنت کے بچے دیگر مکاتب فکر یا عیسائی مشنری اسکولوں میں پڑھتے ہیں، وہیں سے ان کے





ذہن و فکر کے سادہ اوراق متاثر ہوتے ہیں اور پھر شروع ہو جاتا ہے اپنے ہی گھر کی چہار دیواری میں معرکہ حق و باطل اور پھر اسی کے بطن سے جنم لیتا ہے فکری ارتداد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ اسی طرح تبلیغی جماعت کے مقابل ہمارے یہاں کوئی منظم تحریک نہیں تھی، دیوبندی مکتب فکر کا نصف حصہ تبلیغی جماعت کی کاشت ہے۔ ہمارے یہاں جو تبلیغی تحریکیں کام کر رہی ہیں افسوس ان کی شدید مخالفت ہو رہی ہے بلکہ ان کی تکفیر تک کی جا رہی ہے۔ الامان والحفیظ۔

سیرتِ رسول ﷺ ہر دور کے لیے کامل نمونۂ حیات ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے اس میں رہنما اصول ہیں لیکن سردست ہم بات کریں گے دعوت و تبلیغ کی۔ دعوت و تبلیغ میں تدبیر و حکمت اور اسلوبِ لطیف کی بڑی اہمیت ہے۔ مدنی تاج دار ﷺ خلقِ عظیم کے پیکر تھے، آپ کی نرم خوئی اور بلند اخلاقی کی برکت تھی کہ جان کے دشمن بھی حلقہ بگوش غلاموں میں شامل ہو گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لا انفضوا من حولک." (آلِ عمران: ۱۵۹)

ترجمہ: تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہاری گرد سے پریشان ہو جاتے۔

آپ سرکار علیہ السلام کی پوری زندگی اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ان کے سامنے اسلام کے سخت ترین دشمن بھی آئے اور جان کے دشمن بھی، مگر آپ نے کبھی کسی کو خبیث و مردود کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ ایک بار ایک برکاتی بزرگ فرمانے لگے کہ ہماری خالہ صاحبہ کہتی تھیں کہ ہمارے خاندان (خانوادہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ) کے مرد کبھی گالی نہیں دیتے تھے۔ مگر جب سے فلاں مولانا صاحب آنے لگے ہمارے گھر کے مرد خبیث و مردود کہنے لگے۔

خیر مجھے عرض کرنا یہ ہے کہ اسلوبِ دعوت میں لطافت و حکمت سیرت رسول ﷺ کا عظیم پیغام ہے اور جب بھی دعوت و خطابت میں اس رخ کو نظر انداز کیا گیا ہے، بجائے فائدہ کے نقصان ہوا ہے۔ سخت سے سخت بات اگر لطیف اور نرم لہجے میں کہی جائے تو انسان اس پر غور کرتا ہے اور سخت لہجے میں ہلکی بات بھی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اس وقت اہل سنت و جماعت کے داعیوں کا ایک طبقہ ایسا ہے کہ وہ نہ صرف سخت اسلوب اختیار کرتا ہے بلکہ اسٹیج پر بھی فحش گوئی تک سے شرم محسوس نہیں کرتا اور مقام افسوس یہ ہے کہ وہ اس تشدد بھرے اسلوب کو تصلب فی الدین کا نام دیتا ہے اور باقی علما اور خطبا پر صلح کلیت کا الزام عائد کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس قسم کے چند افراد ہیں، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔ اہل سنت کے جلسوں اور کتابوں کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ ان کے یہاں گالیاں اور پھکڑ بازیاں ہوتی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ ہمارے جلسوں میں شرکت سے اجتناب کرتا ہے۔

حدیثِ رسول ﷺ ہے۔ ذوالخویصرہ یمانی نام کا ایک شخص مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ اس کو اپنی نادانی اور جہالت کی وجہ سے مسجد کے آداب معلوم نہیں تھے۔ یہ قبیح حرکت دیکھ کر صحابۂ کرام اسے مارنے کے لیے دوڑے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی بے شعوری کا خیال کر کے ان کو روکا اور ان سے فرمایا گندی جگہ پر پانی بہا دو اور اس نادان اعرابی کو آقا نے مسجد کے آداب بتائے اور طہارت و پاکیزگی کی اہمیت بتائی۔ اس پر وہ رسول اللہ ﷺ سے معافی کا خواستگار ہوا۔ اس وقت اعرابی کی زبان پر یہ الفاظ تھے: اللھم ارحمنی و محمدا ولا ترحم معنا احداً. اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی کو رحمت میں شامل نہ فرما۔

امام احمد رضا قدس سرہ کی تحریک تصلب فی الدین اور علم و عشق کی تحریک ہے جو اپنے طے شدہ نشانوں پر بڑی حد تک کامیاب ہے۔ امام احمد رضا قدس سرہ تشدد پسند نہیں بلکہ پیکر علم و اخلاق تھے۔ صاحبِ خلقِ عظیم کا سچا عاشق کبھی تشدد پسند ہو ہی نہیں سکتا۔ اغیار انھیں شدت پسند کہتے ہیں، یہ ان کا الزام ہے۔ وہ اپنے فکر و اعتقاد میں متصلب تھے اور عقیدہ و فکر میں تصلب اسلام کا داعیہ ہے، دشمنانِ اسلام کے لیے سخت گیری، غیرتِ عشق رسول کا جبری تقاضا ہے۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اس وقت "رضا مشن" کا تعلیمی اور تحقیقی ہیڈ کوارٹر ہے۔

ہماری انفرادی ذمہ داری یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام پر عمل کریں اور اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ دعوت و تبلیغ اور فروغِ اہل سنت کے لیے مصروفِ عمل رہیں۔ اور اجتماعی ذمہ داری یہ ہے کہ ذاتی اور مخفی مفادات کی قربان گاہ پر قومی اور جماعتی مفادات کو بھینٹ نہ چڑھائیں۔ بلکہ اجتماعی فکر و عمل کے ساتھ ہر گوشۂ عالم تک اسلام کا نور پہنچانے کی نت نئی راہیں تلاش کریں۔ ☆☆

زنا کی اسلامی سزا

# زنا کا اسلامی و تعزیری قانون

علامہ پیر محمد کرم شاہ ازہری

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۔ (النور:۲)

شریعتِ اسلامیہ کے تعزیری قوانین میں سے ایک اہم قانون کا ذکر ہو رہا ہے۔ انسان کی جان، مال، ناموس کی حفاظت اسلامی قوانین کا مقصد اولین ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کی جان کو تلف کرتا ہے تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ اگر کسی کے مال پر دست اندازی کرتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر کوئی شخص کسی کی عزت کو داغ دار کرتا ہے تو اس کو دُرّوں اور رجم کی سزا دی جائے گی۔ اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں ان میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ مجرم کو اس کے کیے کی سزا دی جائے، دوسری یہ کہ وہ لوگ جن میں جرائم کے ارتکاب کا میلان پایا جاتا ہے وہ اس خوف ناک سزا سے ڈر کر جرائم کا ارتکاب نہ کریں اور چاہیے بھی ایسا۔ اگر کسی سزا میں یہ دو عنصر مفقود ہیں تو اسے سزا کہنا ہی غلط ہے۔ گناہ کے ارتکاب سے جو لذت اور فائدہ حاصل ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اگر سزا ہلکی ہوگی تو لوگ اس سزا کو خاطر میں نہیں لائیں گے اور حصولِ لذت کے لیے جرم کا ارتکاب کرتے رہیں گے۔ اور اگر سزائیں دوسروں کے لیے عبرت کا پہلو نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ چاہتے ہی نہیں کہ اس جرم کا سدباب ہو اور کوئی اس کے نزدیک نہ پھٹکے۔ آپ صرف ضابطے کی کارروائی پوری کرنا چاہتے ہیں، آپ کو اس سے سروکار نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ تو بچوں کا ایک کھیل ہوا، اس کے پیشِ نظر معاشرہ کو گناہوں سے پاک کرنا اور ان کے خطرناک نتائج سے محفوظ رکھنا نہ ہوا۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ جس ملک میں اس کا پرچم لہرا رہا ہے وہاں امن ہو، سکون ہو، محبت ہو، پیار ہو تاکہ وہاں کے بسنے والے اپنی صلاحیتوں کو نیکی اور اصلاحی سرگرمیوں میں خرچ کر سکیں۔ تعمیری کاموں کے لیے ان کے پاس وقت کی قلت نہ ہو، عداوت، حسد، منافرت کے شعلے ان کے خرمنِ عافیت کو جلا کر خاکستر نہ کرتے رہیں، اس لیے اس نے انسدادِ جرائم کی ادھوری اور غیر موثر کوشش نہیں کی بلکہ ایک جامع منصوبہ بنایا، جس پر عمل کرنے سے سوسائٹی ان جرائم سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں خداوند ذوالجلال پر ایمان اور روزِ محشر کے محاسبہ کا خوف پیدا کیا اور یہ حقیقت ان کے سامنے واضح کر دی کہ جس خدا کو تم اپنا معبود کہتے ہو، جو تمہارا اور سارے عالم کا خالق و مالک ہے، اس نے ان اعمال کو جرم قرار دیا ہے۔ اگر تم ان کا ارتکاب کروگے اور وہ ہمہ دان اور ہمہ بین بھی ہے، تم اس سے اپنا کوئی عمل چھپا نہیں سکتے، تصنع اور بناوٹ کے رنگین غلافوں میں لپیٹنے کی کوشش وہاں کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ تم اپنے حسن نیت یا مجبوری کو کتنے موثر پیرایہ میں بیان کرو تم اسے فریب نہیں دے سکتے، وہ تمہارے اعمال کے محرکات اور عوامل سے خوب آگاہ ہے اور قیامت کے دن تم اپنے ان اعمال کی جواب دہی کے لیے اس کی بارگاہ میں ضرور پیش کیے جاؤگے۔

اسلام دینِ فطرت ہے، اس کا نظام شریعت ایسا نہیں جو انسان کے فطری تقاضوں سے ہر وقت برسرِ پیکار ہو۔ اللہ تعالیٰ ان فطری تقاضوں کا خالق ہے اور ان تقاضوں کی تخلیق میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں، اس لیے اس نے ان کی تکمیل کے تمام جائز، مناسب اور خوب صورت طریقوں کو جائز قرار دیا ہے۔ فطری تقاضوں کی تکمیل کے جائز طریقوں کے ہوتے ہوئے جو شخص غلط راستہ اختیار کرتا ہے وہ اسے سزا دیتا ہے اور سزا بھی ایسی جس سے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب کر کے اس نے اپنے ساتھ سراسر زیادتی کی ہے بلکہ دیکھنے اور سننے والے کو بھی ایسی عبرت ہوتی ہے کہ وہ اس کے ارتکاب کی جسارت شاذ و نادر ہی کیا کرتے ہیں۔

وہ متعدد اعمال جس کے ارتکاب کو اسلام نے جرم قرار دیا ہے، ان میں زنا بھی ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسری آیت میں اس





سے ممانعت کی حکمت بڑے بلیغ انداز میں صرف دو لفظوں میں بیان کر دی:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۔ (بنی اسرائیل:۳۲)

یعنی زنا کے قریب بھی نہ جاؤ یہ بڑی بے حیائی ہے اور یہ راستہ بہت برا ہے۔ یعنی تمھیں اس فعل بد سے ہم اس لیے نہیں روک رہے کہ تم لطف نہ اٹھاؤ، تمہاری زندگی کا دامن مسرتوں سے خالی رہے، بلکہ اس میں سراسر تمہارا ہی فائدہ ہے۔ یہ فعل مجسم بے حیائی ہے۔ اگر تم اس کا ارتکاب کروگے تو شرم و حیا کی قوت جو تمھیں ہر برے کام سے، ہر رذیل حرکت سے، ہر خلافِ مروت اقدام سے روکتی ہے، بلکہ گناہوں اور بدکاریوں کے سیلاب کے سامنے سد سکندری بن کر کھڑی ہو جاتی ہے، وہ کم زور پڑ جائے گی، وہ بیمار پڑ جائے گی، حتیٰ کہ دم توڑ دے گی اور جب یہ قوت فنا ہو جائے گی تو غیرت و حمیت کا جنازہ نکل جائے گا۔ پھر اگر کوئی یہ فعل شنیع جس کے تصور سے ہی تم کانپ اٹھتے ہو، تمہاری بیوی، بہن، بلکہ بیٹی کے ساتھ بھی کرے تو تم اسے کوئی اہمیت نہ دوگے۔ یورپ، امریکہ اور ان سے متاثر ہونے والے ملکوں میں کیا ہو رہا ہے، رقص گاہوں میں لوگ اپنی آنکھوں سے اپنی بہو بیٹیوں کو دوسروں کی آغوش میں دیکھتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے، بلکہ وہ دیوث فخر سے اترا رہے ہوتے ہیں اور داد دے رہے ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کسی مسخ شدہ ذہن والے آدمی کے نزدیک اخلاقِ عالیہ کی یہ گراں بہا قدریں کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں، وہ محض انھیں قدامت پرستی اور رجعت پسندی کی علامت قرار دیتا ہو، لیکن ساء سبیلا (یعنی بہت برا راستہ) فرما کر ایسے کند ذہن کو بھی حقائق کی تلخیوں، حالات کی بے رحمیوں اور واقعات کی سنگینیوں کے روبرو کر کے کھڑا کر دیا ہے۔ یعنی راستہ ہی بہت برا راستہ ہے۔ چند لمحوں کی فانی اور جھوٹی مسرت کے لیے انسان اپنی صحت کو کن خطرات سے دوچار کر دیتا ہے۔ آتشک، سوزاک وغیرہ موذی امراض کس کا کرشمہ ہیں، یہ تحائف کون دیتا ہے اور کسے دیتا ہے، وہ عورت جو مرد کی شہوت رانی کا شکار ہوتی ہے، اسے اگر حمل ٹھہر گیا تو وہ کہاں سر چھپائے گی، حمل گرانے کی صورت میں وہ اپنی جان بھی کھو سکتی ہے۔ ہم نے مانا کہ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے ہسپتال اور کلینک موجود ہیں جو اسقاطِ حمل کی خدمت انجام دیتے ہیں اور ایسی پناہ گاہیں بھی موجود ہیں جہاں غیر شادی شدہ ماؤں کو پناہ مل جاتی ہے، لیکن کیا سوسائٹی میں انھیں کوئی قابلِ احترام مقام نصیب ہو سکتا ہے۔ ہم نے مانا کہ ان دونوں نے اپنے کیے کی سزا پائی لیکن وہ بچے جو اس طرح پیدا ہوتے ہیں ان کا کیا قصور ہے؟ اس بے رحم باپ نے بھی ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ ماں بھی اسے محتاج خانے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ نہ ان کو ماں کی آغوشِ محبت نصیب ہوئی، نہ باپ کا ظلِ عاطفت۔ یہ محرومیاں اسے ورثہ میں کیوں ملیں۔ یہ سزا انھیں کس گناہ کی مل رہی ہے، کیا ان بچوں کے اذہان متاثر نہیں ہوئے۔

چند برس ہوئے امریکہ کی ایک خاتون کوریا گئی، وہاں اس نے بے شمار ایسے معصوم بچے دیکھے جن کی مائیں تو کوریائی تھیں لیکن ان کے باپ امریکہ کے وہ سپاہی تھے جو کوریائی جنگ میں اہل کوریا کی مدد کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ وہ کوریا والوں کو کمیونسٹوں کی غلامی سے چھڑانے آئے تھے، وہ انھیں جمہوریت کی بالادستی کا سبق ازبر کرانے آئے تھے، وہ سبق تو انھیں ازبر ہوا یا نہیں البتہ یہ ضرور ہوا کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کورین دوشیزائیں ان کے ڈالروں کی جھنکار سے مسحور ہو کر یا جنگ کی لائی ہوئی محرومیوں اور فاقوں سے مجبور ہو کر اپنی عصمت کی دولت لٹا بیٹھیں اور ان کے مہربان امریکی حلیف انھیں حرامی بچوں کا ایک لشکرِ جرار دے گئے۔ خود تو وہ اپنے وطن واپس چلے گئے اور وہ معصوم بچے اپنے ظالم جفاکار اور طوطا چشم باپوں اور غربت زدہ ماؤں کی مفارقت کے صدمے برداشت کرنے کے لیے کوریا میں رہ گئے اور وہ اب تک وہاں کے گلی کوچوں میں دھکے کھا رہے ہیں، ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ امریکہ کی اس خاتون نے جب یہ حال دیکھا تو رحم کی ایک رو نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس نے امریکہ کے اخبارات میں ایک اپیل شائع کی کہ ان بچوں کی سرپرستی کے لیے امریکہ کے دولت مند چندہ دیں۔ لاکھوں ڈالر چندہ ہوا، اخبارات میں امریکہ کی غریب پروری اور انسانیت نوازی کی تشہیر ہوئی اور خوب تشہیر ہوئی، لیکن سوچیے ان لاکھوں بچوں میں سے اگر ہزار دو ہزار بچے کفالت میں لے بھی لیے گئے تو کیا یہ مسئلہ حل ہو گیا؟ باقی رہ جانے والے بچوں کے دکھ کا مداوا اور درد کا درماں ہو گیا؟ ان کفالت میں لیے جانے والے بچوں کو ماں کا پیار اور باپ کی محبت بھی مل گئی؟ وہ محترمہ اس ہنگامہ آرائی کے بجائے اگر اپنے سپوتوں کو شرم و حیا کا درس دیتی اور اس فعل شنیع سے باز آنے کی تلقین کرتی تو کیا یہ اچھا نہ ہوتا۔ آگ لگا کر اسے بجھانے کی ناکام کوشش سے کیا یہ بہتر نہیں کہ آگ لگانے کی حماقت ہی نہ کی جائے۔ وساء سبیلا کے الفاظ کتنے جامع ہیں۔ آپ ان افراد، ان خاندانوں اور قوموں کا جتنی گہری نظر سے تجزیہ کریں گے

آپ کے سامنے ہول ناک حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے، آپ بڑے فراخ دل، مغربیت زدہ اور جدت پسند ہونے کے باوجود کانپ جائیں گے، لرز جائیں گے۔

دوسری جنگ عظیم میں امریکہ کے سپاہی اپنے دوست ملک برطانیہ کی مدد کے لیے تشریف لائے تھے، وہ چند سال برطانیہ میں ٹھہرے اور جب گئے تو سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۷۰ رہزار حرامی بچے چھوڑ کر گئے۔ اس کے علاوہ جو جنسی لاعلاج بیماریاں انھوں نے ایک دوسرے کو بطور تحفہ دی ہوں گی ان کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ آپ اپنے قانون ساز اداروں کے ذریعہ ایک فعل کو جرائم کی فہرست سے نکال سکتے ہیں۔ اگر آج تک وہ حرام اور ممنوع رہا تو آپ ایک بل پاس کر کے اسے جائز قرار دے سکتے ہیں، لیکن کیا کسی قانون ساز ادارے میں یہ طاقت ہے کہ ان جرائم کو جنھیں اب قانون کی سند مل گئی ہے، ان کے برے نتائج و عواقب سے الگ کر سکے۔ مغرب کے بیش تر ممالک میں اگر کوئی غیر شادی شدہ مرد یا عورت اپنی مرضی سے اس فعل شنیع کا ارتکاب کرے تو وہاں ملکی قانون کی روسے یہ جرم نہیں، آپ انھیں کوئی سزا نہیں دیں گے، لیکن کیا قدرت کی گرفت سے بھی کوئی انھیں بچا سکتا ہے؟ قدرت کی گرفت کے مختلف انداز ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر اوپر ہوا۔ کیا قدرت کا بے لاگ قانون انھیں مختلف شکنجوں میں نہیں کس رہا ہے؟ یورپ کے بعض ملکوں میں حرامی بچوں کی شرح پیدائش ساٹھ فی صد سے بھی متجاوز ہو گئی ہے اور غیر شادی شدہ ماؤں میں ہوش ربا اضافہ ہو رہا ہے۔ طلاقوں کی کثرت ہے، گھروں میں سکون کی دولت نہیں ملتی، میاں بیوی میں اعتماد مفقود ہے۔ میاں بیوی میں وہ سچی محبت جس کے ہم یہاں خوگر ہیں، جس کی وجہ سے میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار کی حیران کن مثالیں قائم کرتے ہیں، اس کا نام و نشان تک وہاں نہیں۔ برداشت اور ایثار کا جذبہ ختم ہو چکا ہے، کوئی بات کسی کی مرضی کے خلاف ہو گئی جھٹ سے طلاق حاصل کر لی۔ خود غور فرمایئے! گھر معاشرہ کی خشت اول ہے، یہ وہ محکم اساس ہے جس پر معاشرے کا محل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ بنیاد ہی کم زور ہو گی تو صحت مند معاشرہ کیسے تعمیر ہو گا۔

اس لیے جب آپ شریعت اسلامیہ کا مطالعہ فرمائیں تو ازراہ خدا ابھرے ہوئے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے مرعوبیت کے احساس کے زیر اثر ہو کر نہ کیا کریں، بلکہ ان تمام چیزوں سے بلند ہو کر کیا کریں۔ بے شک آپ جذبۂ عقیدت کو بالائے طاق رکھ دیں، لیکن حقیقت کا دامن تو کسی کے کہنے یا بہلانے سے نہ چھوڑ دیا کریں۔ اسلام دین فطرت ہے، اس کی حقیقت پسندی جب آپ کے سامنے عیاں ہو گی تو اس کا حسن خود ہی آپ کو مسحور کر دے گا۔

اسلام نے جن چیزوں کو بجا لانے کا حکم دیا ہے اس میں ہمارا، ہماری قوم کا بلکہ ساری انسانیت کا بھلا ہے اور جن چیزوں سے روکا ہے، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس میں ہمارا، ہماری قوم کا اور ساری انسانیت کا نقصان ہے، کیوں کہ یہ دین ابد تک کے لیے ہے، اس لیے کوئی ایسا وقت نہیں آسکتا کہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں حلال ہو جائیں یا ان پر مرتب ہونے والے نقصانات ختم ہو جائیں۔

یورپ کے کئی ممالک میں شراب پینا اور جوا کھیلنا قانوناً جائز ہے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہاں شراب پینے اور جوا کھیلنے سے وہ مضرتیں رو پذیر نہیں ہوتیں جن کے باعث شراب و قمار کو ممنوع کیا گیا تھا، بلکہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے حکومت کو بہت بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ اگر ان چیزوں کو ممنوع قرار دیا جائے تو حکومت اس آمدنی سے محروم ہو جائے گی۔ غور فرمایا آپ نے عقل انسانی کی قلابازیوں کا کیا حال ہے۔ جب جرائم اور قبائح کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر ہی الگ ہے تو ان کے انسداد کے لیے اسلام کا طریقۂ کار اگر دیگر اقوام سے الگ ہو تو اس میں قطعاً کوئی حیرت نہیں۔ مجرم کے ساتھ ایسی مہربانی اور شفقت جو دوسرے بے شمار لوگوں کو جرم کے ارتکاب پر جری کر دے، اس سے وہ سختی بہتر ہے جو مجرم سے وہ ہمت چھین لے کہ وہ دوبارہ اس کا ارتکاب کر سکے اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں ایسی دہشت اور خوف پیدا کر دے کہ کسی کے دل میں اس جرم کے ارتکاب کا خیال ہی پیدا نہ ہو۔

زنا کا فعل قبیح کیوں کہ گوناگوں ایسی ہی لازمی اور متعدی خرابیوں کا سرچشمہ تھا، اس لیے اسلام نے بڑی سختی سے منع فرمایا۔ اگرچہ قانون اسلام کو معطل ہوئے عرصہ دراز گزر چکا ہے، شرم و حیا کی اس چادر کو تار تار کرنے کی بڑی منظم کوششیں بھی شروع ہیں، لیکن اپنے ماننے والوں کے دلوں میں اسلام نے جو نفرت اس سے پیدا کر دی ہے اس کے باعث اس فعل شنیع کا ارتکاب نسبتاً بہت ہی کم ہے۔ چند مسخ شدہ گھروں کے علاوہ سارے ملک میں عصمت و عفت کا مقام بہت ہی بلند ہے۔

یہ عرض کرنے کے بعد اب بدکار عورت اور بدکار مرد کے لیے اسلام نے جو سزا تجویز کی ہے اس کو مختصراً پیش کرتا ہوں، انھیں





آپ ابتدائی معلومات کے طور پر ہی قبول فرمائیں، تفصیلات کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کریں، یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں کو بالتفصیل پیش کیا جا سکے۔

زانی مرد اور زانیہ عورت کو شریعت نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے اور اس تقسیم کے پیش نظر ان کی سزاؤں میں تفاوت ہے۔

(۱) غیر شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ مرد۔

(۲) شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت۔

زمانۂ جاہلیت میں دیگر قباحتوں کے ساتھ ساتھ زنا کا رواج بھی عام تھا اور اس کا ارتکاب بے دھڑک کیا جاتا تھا۔ پیشہ ور عورتیں بڑے ٹھاٹ سے اپنی دوکانیں سجاتی تھیں، اونچے اونچے جھنڈے ان کے مکانوں پر لہرایا کرتے تھے، انھیں اور ان کے پاس آنے والوں کو قطعاً حجاب معلوم نہ ہوتا تھا۔

”کان فی ذلک الزمان زنی النساء فاش و کان لاماء العرب و بغایا الوقت رایات و کن مجاھدات بذلک. (قرطبی)

اسلام جو انسان کو رذالت و کمینگی کی ان پستیوں سے نکالنے کے لیے آیا تھا، وہ اس کو کیسے گوارا کرتا، چناں چہ سورۃ الفرقان جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، اس میں اہل ایمان کی دیگر صفات کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا کہ وہ زنا کا ارتکاب نہیں کرتے۔ ”ولا یزنون“۔ اور سورۃ الممتحنہ میں جہاں عورتوں کے مشرف بہ اسلام ہونے اور بیعت کرنے کا ذکر ہے، وہاں ان سے یہ بھی وعدہ لیا جاتا ہے کہ ”ولا یزنین“ کہ وہ آئندہ زنا نہیں کریں گی۔ یاد رہے کہ سورۃ الممتحنہ بھی مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ یہ روحانی اور اخلاقی تربیت تھی جس کی تلقین ہر اسلام قبول کرنے والے کو پہلے دن ہی کی جاتی اور اس سے یہ وعدہ لیا جاتا جس کی پابندی اس پر ضروری ہوتی۔

اس جرم شنیع کا ارتکاب کرنے والوں کے متعلق جو حکم ہوا وہ سورۂ نسا کی آیت ۱۵ میں مذکور ہے کہ شادی شدہ عورت اگر اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کو گھر میں محبوس کر دو، یہاں تک کہ وہ مر جائے یا اللہ تعالیٰ کوئی دوسرا حکم نازل کرے۔

”فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا .“ (البقرۃ:۱۵)

اور غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے ابتدا میں یہ سزا تجویز کی گئی کہ انھیں لعنت ملامت کی جائے اور خوب اذیت دی جائے۔

”وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا .“ (البقرۃ:۱۵)

کچھ عرصہ اسی طرح ہوتا رہا۔ پھر پانچ یا چھ ہجری میں جب سورۃ النور نازل ہوئی تو یہ حکم نافذ ہوا کہ زانی مرد اور زانیہ عورت کو سو کوڑے لگائے جائیں۔ ساری امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و السلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سزا غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے ہے۔ شادی شدہ مرد اور عورت کی سزا یہ ہے کہ اسے رجم کر دیا جائے یعنی اس پر اتنے پتھر برسائے جائیں کہ وہ مر جائے۔ صرف خوارج کا یہ قول ہے کہ سو کوڑوں کی سزا ہر زانی اور زانیہ کے لیے ہے۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی کوئی تخصیص نہیں، انھوں نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے۔ یہاں مطلق زانی کی سزا مقرر کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جن روایات سے رجم کی سزا کا ثبوت ملتا ہے، وہ قرآن کریم کی مخصص یا ناسخ نہیں ہو سکتیں۔ قدیم خوارج کے علاوہ اس زمانہ کے جدید خوارج کا بھی یہی قول ہے۔ ان کی خدمت میں مختصراً اتنی گزارش ہے کہ رجم اخبار آحاد سے نہیں بلکہ احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ حضور سرور عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے بعد بھی متعدد بار رجم کی سزا دی جن کی تفصیل کتب احادیث میں مذکور ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت فاروق اعظم، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم سب نے اپنے اپنے عہد خلافت میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کو رجم کیا۔ ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم قدیم و جدید خوارج سے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بہر حال بہتر سمجھتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین جن کی زندگی کا ہر لمحہ اقامت دین میں صرف ہوا وہ قطعاً کوئی ایسا کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے جس سے فرمان الٰہی کی خلاف ورزی ہو۔ اس واضح تعامل کے باوجود شادی شدہ کے لیے رجم کا انکار کرنا کھلی زیادتی ہے اور اس کا ارتکاب صرف خارجی ہی کر سکتے ہیں۔

### ثبوتِ زنا:- اس کے دو طریقے ہیں۔

(۱) اقرار (۲) شہادت

کیوں کہ یہ بہت گھناؤنا جرم ہے، اس سے انسانیت کی عزت و آبرو جو اس کی متاع گراں بہا ہے متاثر ہوتی ہے، نیز اس کی سزا بھی از حد سنگین ہے، اس لیے اس جرم کو ثابت کرنے کے لیے بڑی احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے، جس اقرار سے یہ جرم ثابت ہوتا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اس فعل کا ارتکاب کرنے والا امام یا نائب کے سامنے چار مرتبہ اور صاف الفاظ میں اقرار کرے کہ اس نے یہ فعل شنیع کیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب ماعز بن مالک سلمی نے آکر یہ عرض کی، یا

رسول اللہ! مجھے پاک فرمایئے! میں نے زنا کیا ہے، تو حضور ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا:

''ویحک ارجع فاستغفر اللّٰہ وتب علیہ.''

(اے جوان واپس چلا جا اور توبہ و استغفار کر)

اس نے پھر سامنے آکر یہی کہا، حضور ﷺ نے پھر منہ پھیر لیا، تیسری مرتبہ بھی اس نے اقرار کیا۔ حضرت صدیق اکبر نے اسے متنبہ کیا کہ اب اگر چوتھی بار بھی تو نے ایسا ہی کہا تو تجھے رجم کر دیا جائے گا۔ لیکن وہ باز نہ آیا، چوتھی مرتبہ بھی وہی الفاظ کہے۔ اب حضور ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''لعلک قبلت او غمزت او نظرت.''

(شاید تو نے بوسہ لیا ہو یا نظر بازی کی ہو)۔

لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ حضور نے فرمایا:

''ابک جنون. قال لا.''

کیا تو مجنوں تو نہیں۔ اس نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا: کیا تو شادی شدہ ہے؟ اس نے عرض کیا: ہاں! یا رسول اللہ ﷺ۔ آخر میں حضور ﷺ نے فرمایا:

''اذھبوا بہ فارجموہ.'' (اسے لے جاؤ اور رجم کر دو)۔

**شہادت:** - شہادت میں بھی حد درجہ کی احتیاط کی گئی ہے۔ چار ایسے مرد گواہ ہوں جو مسلمان، عاقل، بالغ، آزاد اور عادل ہوں، جن کی صداقت اور دیانت ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہو اور گواہی بھی اس طرح دیں کہ انھوں نے ملزم اور ملزمہ کو عین حالتِ مباشرت میں دیکھا ہے۔

''کالمیل فی المکحلۃ والرشاء فی البئر.''

(یعنی جس طرح سرمہ میں سلائی اور کنویں میں رسی)

اگر گواہوں کی گواہی میں جگہ، وقت، مزنیہ وغیرہا امور کے متعلق اختلاف پایا جائے تو گواہی مردود ہوگی اور حد نہ لگائی جائے گی۔

اثباتِ زنا کے لیے اتنی سختی اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت کو لوگوں کو سزا دینے کا شوق نہیں تاکہ جہاں کہیں کسی نے انگشت نمائی کر دی وہاں کوڑے برسنے لگے اور لہو بہنے لگا، یا ذرا موقع پاتے ہی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ سزا ایک انتہائی اقدام ہے جو صرف ایسے شخص کے خلاف ہی کیا جائے گا، جس کے دل میں نہ خدا کا خوف ہے، نہ قیامت کا ڈر ہے، نہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کا پاس ہے اور نہ اسے سوسائٹی میں رسوا اور ذلیل ہونے کا کوئی اندیشہ ہے۔ اس نے یہ کام اس طرح کیا کہ چار آدمیوں نے عین حالتِ مباشرت میں دیکھ لیا، نیز شریعت نے یہ بھی ضروری قرار نہیں دیا کہ جو شخص تنہائی میں چھپ کر یہ کام کر بیٹھے وہ ضرور عدالت میں حاضر ہو کر اس کا اعتراف کرے۔ گواہوں پر بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کے خلاف ضرور جا کر گواہی دیں، بلکہ اسے چاہیے کہ خود بھی اپنا پردہ فاش نہ کرے اور گواہوں کے لیے بھی بہتر ہے کہ وہ اس کی پردہ دری نہ کریں۔ حدیث پاک میں ہے:

''من اتی شیئا من ھذہ القاذورات فلیستتر بستر اللّٰہ فان ابدی لنا صفحتہ اقمنا علیہ کتاب اللّٰہ.'' (احکام القرآن)

یعنی جس کسی سے اس قسم کا گندہ فعل صادر ہو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پردے کو فاش نہ کرے اور جو شخص ہمارے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کرے گا ہم اس پر حکم الٰہی ضرور جاری کریں گے۔ ہزال بن نعیمن سے جس نے ماعز کو بارگاہِ رسالت میں اس جرم کا اقرار کرنے کے لیے بھیجا تھا، حضور ﷺ نے فرمایا:

''لو سترتہ بثوبک کان خیرا لک.''

اگر تو اسے اپنے کپڑے میں ڈھانپ لیتا تو تیرے لیے بہتر ہوتا، لیکن اگر یہ چیز حاکم وقت کے سامنے پیش کر دی جائے اور اقرار یا شہادت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو پھر حاکم کو یہ اختیار نہیں کہ وہ حد قائم نہ کرے۔

''تعافوا الحدود فیما بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب.'' (ابو داؤد، نسائی)

آپس میں حدوں سے در گزر کرتے رہو، لیکن جب وہ حد مجھ تک پہنچ جائے گی تو پھر نفاذ ضروری ہو جائے گا۔

نیز یہ جرم قابل مصالحت نہیں کہ کچھ معاوضہ دے کر قصہ ختم کر دیا جائے۔

ایک لڑکا کسی آدمی کے یہاں کام کرتا تھا، اس نے اس کی بیوی کے ساتھ بدکاری کی۔ لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لونڈی اس کے خاوند کو دے کر راضی کر لیا۔ لیکن جب وہ مقدمہ بارگاہ، نبوت ﷺ میں پیش ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا:

''اما غنمک وجاریتک فرد علیک.''

(باقی ص:۲۲ پر)





جدید علم کلام

# نبوت و رسالت

مولانا محمد اسحاق مصباحی

**اللہ** تعالیٰ کی ذات و صفات کے تعلق سے گزشتہ تین قسطوں میں بیان ہوا۔ اب ہم یہاں بابِ نبوت شروع کر رہے ہیں، اس میں خصوصی طور پر دو حصے ہیں، اول تمام انبیاے کرام کے تعلق سے عام ذکر اور پھر خصوصی طور پر خاتم الانبیا ﷺ کا ذکر۔

**نبوت و رسالت:**- نبی اور رسول وہ انسانِ برگزیدہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے پیغام یعنی وحی سے مشرف فرماتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر کوئی کتاب بھی عطا فرمائے اور ایک نئی شریعت دے تو نبوت کے ساتھ رسالت کا منصب ہوا۔ انبیاے کرام میں بعض ہی کا ذکر قرآن و حدیث میں آیا ہے مگر ان کی تعداد کثیر ہے۔ سب سے اول حضرت آدم اور سب سے آخری حضرت محمد ﷺ۔ نبوت اور رسالت کے مفہوم میں تبدیلی جائز نہیں۔ یعنی بغیر وحی کے ثبوت کے کسی معلم اور کسی مذہبی یا غیر مذہبی شخصیت کو نبی یا رسول نہیں کہہ سکتے کہ یہ کفر ہے۔ یوں ہی نبوت و رسالت کا مطلقاً انکار بھی کفر ہے۔ کسی کو صراحۃً نبی کہنے کے لیے کتاب و سنت سے ثبوت چاہیے ورنہ سکوت لازم ہے، وہ بھی جب کہ اس شخصیت کی تعلیم میں اجزاے ایمان نہ ہوں جیسے توحید، ایمانِ آخرت اور ایمانِ قضا و قدر وغیرہ ورنہ گم راہ ہونا یقینی ہے۔

**نبوت و رسالت کی ضرورت:**- کچھ فلسفی کل بھی نبوت کے منکر تھے اور آج بھی ہیں۔ کچھ مذاہب کسی ایک کی نبوت کا اقرار اور باقی کا انکار کرتے ہیں، کچھ لوگ نبوت کو کسبی اور تزکیۂ نفس سے حاصل ہونے والی شے قرار دیتے ہیں اور معجزہ کے منکر ہیں، یہ چیزیں کفر ہیں۔

نبی اور رسول بندوں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں اور انھیں انسانوں کی ہدایت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، کیوں کہ انسان وجود کی وسعتوں کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے اور اپنے جذبات و خواہشات سے آزاد ہونا اس پر مشکل ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے غیب کی خبر دینے اور جذبات ظلم سے پاک وصاف نظام اور قانون انسانوں کو عطا کرنے کے لیے نبوت کا انتظام فرمایا ہے۔ لہٰذا نبوت اور رسالت انسان پر اللہ تعالیٰ کا ایک احسانِ خاص ہے۔

انسان کا نقصانِ علم ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک ابتداے کائنات، انتہاے کائنات، زمان، جہت، حرکت اور وجود و حیات جیسی چیزوں کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

**وحی:**- اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی یا پیغام جو فرشتہ کے واسطے سے نازل ہوتا ہے اور بسا اوقات بلا واسطہ بھی نازل ہو سکتا ہے، انبیاے کرام کے لیے ماننا ضروری ہے۔ اگر کوئی اس کا منکر ہے تو وہ نبوت و رسالت کا معتقد نہیں ہے۔

جب ہم نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور ذات پر یقین کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ وہ فانی نہیں ہے، مخلوق کے مشابہ نہیں ہے تو اب اس کے ماننے میں کوئی محال نہیں ہے کہ وہ اپنے نبیوں اور رسولوں پر پیغام نازل کر سکتا ہے۔ جو لوگ فرشتہ اور وحی کا انکار کرتے ہیں ان کے انکار کی وجہ تامل اور فکر کی کمی ہے یا غیبی شے کو مادی شے پر قیاس کرنا۔

آج کی دنیا میں اس پر روشن دلیلیں قائم ہیں۔ فضا میں برقی لہریں ایک سکنڈ کے کروڑویں حصے میں کائنات کے اس سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتی ہیں، حالاں کہ وہ ایک زمانی زنجیر میں قید ہیں اور پھر بھی آواز کی برقی لہروں کو منتقل کرنے میں یہ سرعت رکھتی ہیں تو اس میں کیا بعد اور محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغام کسی فرشتے کے واسطے یا بغیر واسطے کے اپنے برگزیدہ بندہ کے قلب پر نازل فرمائے، جیسا کہ صحیح امام بخاری میں **باب بدء الوحی** میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اور بھی کئی حدیثوں میں اس کیفیت کا ذکر ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گھنٹی کی تھرتھراہٹ جیسی آواز محسوس ہوتی تھی اور سرکارِ دوعالم ﷺ کی پیشانی پاک پر سردی میں بھی پسینے کی بوندیں چمکنے لگتی تھیں۔

اسی طرح تاریخی طور پر بھی حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ اور حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والا پیغام مسلم ہے۔ اگرچہ پہلے دونوں والے پیغام ان کے ماننے والوں نے رد و بدل کر ڈالے۔ انبیاے کرام پر نازل ہونے والا پیغام خود بھی یہ بتاتا ہے کہ وہ خالق کائنات کی تعلیم ہے۔

**انبیاے کرام کا مرتبہ:**- اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور بعض کو بعض پر مقدم کیا ہے۔ انبیاے کرام میں سب سے اول حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام اور سب سے آخر سرکار دوعالم حضرت محمد ﷺ ہیں۔ سرکار دوعالم ﷺ کی شریعت تمام سابقہ شریعتوں کی ناسخ اور تمام نبوتوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔

شیخ الحدیث جامعہ رضویہ، کیمری، ضلع رام پور

کسی بھی نبی کی نبوت کا انکار یا کسی نبی کی طرف توہین کی نیت کفر ہے۔ لہٰذا مرزا غلام احمد قادیانی کھلا کافر کہ بہت سی جگہ اس نے حضرت عیسیٰ کے معجزات کا انکار کیا اور توہین کی۔ یوں ہی اسماعیل دہلوی نے لکھا۔ "ہر مخلوق چھوٹا ہو یا بڑا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔" انبیا کی توہین کا مرتکب ہوا۔ ان جیسے بدتمیز لوگوں کا ایمان سے کیا رشتہ، یہ تو مہذب سماج کا حصہ بھی بننے کے لائق نہیں، چہ جائے کہ کوئی ان کو امام کہے۔

انبیاے کرام سے عقل کا زوال یا نبوت کا سلب محال ہے، ان کے حق میں اس بات کو ماننا کفر ہے کیوں کہ عقل کا زوال اور نبوت کا سلب ان کے منصب کے خلاف ہے۔ ان کی طرف جہل، عبث، دناءت، رذالت کی نسبت کرنا کفر ہے۔ انبیاے کرام معصوم ہیں یعنی ان سے گناہ کا صدور محال ہے، گناہِ کبیرہ اور صغیرہ دونوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ نبوت کے اعلان سے قبل اور بعد میں بھی انبیاے کرام جیسی عصمت دوسرے انسانوں کی ماننا عقیدۂ اہل سنت کے خلاف ہے۔ ہاں! کسی کا گناہ سے محفوظ رہنا، یہ اور بات ہے۔ اسی طرح انبیاے کرام کا تبلیغ میں کوتاہی کرنا ثابت نہیں جو ان کو کوتاہی کرنے والا مانے وہ گم راہ ہے جیسا کہ ابو الاعلیٰ مودودی نے حضرت عیسیٰ کے تعلق سے اپنی کتابوں میں تحریر کیا اور ان کی تبلیغ کو ناقص قرار دیا، یہ کھلی گم راہی ہے۔

انبیاے کرام کا صدق سے متصف ہونا بھی لازم، ان پر کذب کی تہمت لگانا کفر ہے۔ جن لوگوں نے اپنے پیروں کے لیے انبیاے کرام جیسی عصمت ثابت کی یا غیر نبی کے لیے وحی کا اقرار کیا، جیسا کہ اسماعیل دہلوی نے صراطِ مستقیم میں کیا، یا انبیاے کرام کی طرف کذب کی نسبت کی صراحۃً یا ایسے انداز سے کہ اس سے کذب کی نیت لازم آتی ہو، یہ سب عقیدے اور گم راہیاں حد کفر تک پہنچتی ہیں۔

اس سلسلے میں امام احمد رضا محدث بریلوی کی تصانیف خصوصاً "تمہید الایمان، حسام الحرمین، الامن و العلی، سلطنت مصطفیٰ اور المستند المعتمد" بلکہ ان کی وہ جملہ تصانیف جو شیعہ، وہابیہ، غیر مقلد وغیرہ کے رد میں ہیں، ضرور مطالعہ کرنا چاہیے اور بہارِ شریعت کا پہلا حصہ بھی بغور پڑھنا چاہیے۔ عربی کتابوں میں "شرح فقہ اکبر، المعتقد، کتاب الشفا للقاضی عیاض" اور فارسی میں "مدارج النبوت" کا مطالعہ مفید ہے۔ انبیاے کرام کی عصمت کے ساتھ ساتھ معجزے کا ثبوت بھی لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جملہ انبیاے کرام کو کسی نہ کسی معجزہ سے ضرور سرفراز فرمایا ہے۔ لہٰذا معجزہ کی بحث ہم ذکر کرتے ہیں۔

**معجزہ:-** شرح فقہ اکبر لملا علی قاری میں ہے:

"المعجزہ امر خارق للعادۃ کاحیاء میت و اعدام جبلٍ علی وفق التحدی وھو دعویٰ الرسالۃ." (ص:۱۳۰)

یعنی معجزہ ایسا امر ہے جو عادت کا خارق ہو جیسے مردے کو زندہ کرنا یا پہاڑ کو نابود کرنا تحدی کے مطابق یعنی دعواے نبوت کے ساتھ۔ اس تعریف میں دو لفظ شرح طلب ہیں:

(۱) خارق عادت (۲) تحدی

خرقِ عادت کا مطلب ہے قانونِ فطرت جو دنیاے اسباب میں جاری ہے۔ یہ معجزہ اس کو توڑ دیتا ہے، جیسے کہ مُردے کو زندہ کرنا کہ زندگی روح پرواز کرنے کے بعد لوٹنا محال ہے عادۃً۔ اور تحدی کا مطلب ہے دعواے نبوت پیش کر کے اس کے لیے دلیل کے طور پر یہ معجزہ ظاہر کیا جائے کہ اے مخاطب! میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور تم میں سے کوئی اس فعل کو نہیں کر سکتا۔

دعواے رسالت کے بعد جو کمالات خارق عادت ہوتے ہوئے انبیاے کرام سے صادر ہوتے ہیں وہ اعجاز کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں، یہ معجزات تو کائنات کے مظاہر پر وارد ہوتے ہیں۔ جیسے چاند کے دو ٹکڑے کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا۔ بہر حال انبیاے کرام کا علم اور ان کا اخلاق اور ان سے صادر ہونے والے خارق عادت کمالات سب معجزہ ہی ہوتے ہیں۔

**خرق عادت اور سائنس میں فرق:-** خرق عادت کی وضاحت یوں بھی کیا جا سکتا ہے یعنی جو طریقہ اللہ تعالیٰ تعالیٰ نے فطرت کو ودیعت کیا ہے جیسے پانی کا پیاس بجھانا، آگ کا جلانا، مختلف رفتاروں کا معین وقت کو گھیرنا، معجزہ میں ان قواعد اور اصول کو توڑ دیا جاتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے دریاے قلزم سے گزرتے وقت پانی کے دونوں حصے قائم ہو گئے تھے اور اس میں جھروکے بن گئے تھے، حالاں کہ یہ پانی کی طبیعت اور اصول میں سے ہرگز نہیں تھا۔ لہٰذا سائنسی ایجادات اور کارنامے معجزہ نہیں ہو سکتے۔ اول اس لیے کہ ان کے موجدین نبوت کے مدعی نہیں، دوم اس لیے کہ کوئی بھی ایجاد فطرت کے اصول کے خلاف نہیں بلکہ فطری اصول پر ہی ان کو بنایا گیا ہے، جیسا کہ اہل فن جانتے ہیں کہ سائنس میں فطری اصول کو نہایت باریکی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہوا کے دباؤ اور حرکت و قوت کے توازن کے اصول پر ہوائی جہاز اڑتے ہیں، برقی اجزا ایتھر پر لہر لے کر چلتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں ایجادات ہیں۔ غرض سائنسی ایجادات کتنی ہی حیران کن ہوں فطرت کے عین مطابق ہوتی ہیں، خارق عادت نہیں ہوتیں۔ تیسرے یہ بات بھی معجزہ میں ہوتی ہے کہ وہ دفعۃً منجانب اللہ تعالیٰ نبی کے لیے ثابت ہوتی ہے۔ اس کے لیے تدریج، تعلیم اور تجربہ نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت صالح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے پتھر سے اونٹنی کا پیدا ہونا، سرکارِ دوعالم کے حکم سے کنکریوں کا کلمہ پڑھنا۔ ہاں!





سائنسی ایجادات میں ایک نسل کا تجربہ اگلی نسل کی ایجادات کے لیے بنیاد بنتا ہے۔

**قرآن و سنت میں بعض کلمات:-** کتاب و سنت میں بعض کلمات ایسے آئے ہیں کہ انبیاے کرام کی شان میں جن کلمات کی تشریح و توضیح کے لیے علماے راسخین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے اور صرف لغت سے ان کی تشریح نہیں کی جا سکتی ہے۔ ان کلمات کی تشریح کے لیے حضرت صدر الافاضل رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر خزائن العرفان اور حضرت شارح بخاری مفتی شریف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شرح بخاری شریف کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اسی طرح بعض انبیاے کرام کے تعلق سے بعض واقعات تفسیر کی کتابوں میں بنی اسرائیل سے منقول ہو کر آ گئے ہیں۔ ان واقعات کو یوں قبول نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کو بھی خزائن العرفان کی تحقیق کے مطابق ہی سمجھنا چاہیے۔

ہم ان تمام واقعات اور مشتبہ کلمات کو اسی سلسلے میں مکمل ایک قسط میں بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اسی طرح کچھ نفوسِ قدسیہ ایسے ہیں جن کی نبوت میں اختلاف ہے جیسے کہ حضرت خضر اور حضرت لقمان اور حضرت سکندر ذوالقرنین، مگر ان کے تعلق سے درجۂ ولایت اکثر علما کا مذہب ہے۔ یوں ہی حضرت یوسف علیہ السلام کے باقی بھائیوں کے تعلق سے اختلاف ہے اور راجح ان کی نبوت ہے اور حضرت مریم کی نبوت اہل تحقیق کے نزدیک ثابت نہیں کہ رسالت و نبوت کے لیے کتاب اللہ تعالیٰ سے ذکورت شرط ہے۔

علماے کرام نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جھوٹے مدعی کے ہاتھ پر معجزہ کو ظاہر نہیں کرتا ہے، یوں ہی جادوگر معجزہ کے سامنے تاب نہیں لاتا ہے۔

جادو اور معجزہ کا فرق ہر انسان پر واضح ہوتا ہے اس لیے مخاطب پر کسی نبی کے دور میں معجزہ اور جادو میں اشتباہ نہ ہوا۔

جادو میں یا تو خفیہ سائنسی تجربات ہوتے ہیں یا ہاتھ کی صفائی، ان میں خرق عادت نہیں۔ تو ان سب چیزوں کا معجزہ سے کوئی اشتباہ نہیں کیوں کہ شیاطین اور طواغیت کی عبادت کرنے والا خداے تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت نہیں دے سکتا، جو دعوت ایک نبی کا منصب ہوتی ہے۔ اب جو کفار عرب نے معجزۂ قرآن کو سحر کہا تھا تو وہ سحر مجازی معنی میں تھا یعنی ایسی شے جو قابل مقابلہ نہیں کیوں کہ عرب حیرت انگیز شے کو سحر کہتے ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ جانتے ہوئے بھی اس کو سحر کا یوں بھی نام دیتے تھے تاکہ لوگ جادو سمجھ کر ان کے حلقۂ غلامی میں داخل نہ ہوں۔ قرآن نہ سنیں تو ان لوگوں کو اس طرح قرآن کو جادو کہنا صرف عناد تھا اور اس کی تاثیر غیبی کا دبے الفاظ میں اقرار کرتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ معجزہ اور سحر میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

**دوسری قوموں کا دعواے اتباع:-** سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اور آپ کے اعلانِ نبوت کے بعد کسی نبی کی شریعت آپ کی شریعت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز الاتباع نہیں۔ مگر بعض لوگ آپ کے روشن معجزات کے باوجود ایمان کے لیے تیار نہیں۔ وہ لوگ جن کے پاس کتاب ہونے کا دعویٰ ہے، خاص طور پر یہود و نصاریٰ۔ یہ لوگ اب ان باتوں کے قائل ہیں جو انبیاے کرام کی شان کے لائق نہیں، جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت مریم نے یوسف نجار سے شادی کی تھی اور حضرت مریم نے بعد میں حضرت عیسیٰ کا جنم دیا تھا۔ یہودی ان کو غیر معتبر اولاد مانتے ہیں۔ یہ دونوں عقیدے کفر ہیں اور دونوں میں حضرت عیسیٰ کے مرتبہ کے خلاف اقرار ہے۔ یوں ہی یہودی حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کرتے ہیں، ان کے تعلق سے ایسا عقیدہ کفر ہے۔

بہت سے لوگ انبیاے کرام پر فلمیں بناتے ہیں اور ان کی طرف فرضی مکالموں کی نسبت کرتے ہیں، ایسا عمل کفر ہے۔

انبیاے کرام کی ذات وصفات، اور ان کے مرتبہ کو جاننا اور ان کی عزت کے آداب سمجھنا ہر مکلف انسان پر فرض ہے، کیوں کہ کسی بھی نبی اور رسول کی ادنیٰ سی توہین بھی کفر ہے۔ لہٰذا جو لوگ ان نفوسِ قدسیہ کے تعلق سے عام لوگوں کی طرح انداز اختیار کرتے ہیں اور عام آدمی اور ان کے مرتبے میں فرق نہیں کرتے، ان کے کلمات پر تنقید کرتے یا ان کی طرف کسی بے ہودہ بات کی کسی بھی انداز سے نسبت کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔ ان کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔

مسلمانو! تم پر فرض ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور انبیا کے تعلق سے معرفت و آداب اپنی اولاد کو تعلیم دو یا دلاؤ اس کو معمولی نہ سمجھو، آخرت کی صلاح اسی پر موقوف ہے۔ افسوس! مسلمان ایمان کے اس اہم پہلو پر بہت کم توجہ دے رہے ہیں جس کا پتہ آج ایک عام مسلمان کے اندازِ تکلم سے چل جاتا ہے کہ علماے کرام کو بار بار لوگوں کو ٹوکنا پڑتا ہے۔ اگر آج مسلمان عقائد کی درست تعلیم اپنے بچوں کو دیں تو امید ہے کہ وہ گم راہیوں سے محفوظ رہیں۔

(جاری)

☆☆☆☆☆

# پیشین گوئی

حضرت نعمت اللہ شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ — ترجمہ: حافظ محمد سرور نظامی پاکستان

معروف تاجر اور صاحب خیر عالی جناب الحاج رفیق برکاتی صاحب نے یہ دستاویزی مقالہ برائے اشاعت راقم الحروف کو عطا فرمایا۔ ہم ان کے شکریے کے ساتھ یہ گراں قدر مقالہ قسط وار اشرفیہ کے صفحات پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ مقالہ دراصل جلیل القدر ولی حضرت نعمت اللہ شاہ علیہ الرحمہ کے اشعار کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ یہ خدمت حافظ محمد سرور نظامی نے بڑے سلیقے سے انجام دی ہے۔ مرتب و شارح اپنے مقالے کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

لوح محفوظ است پیشِ اولیا — از چہ محفوظ است محفوظ از خطا

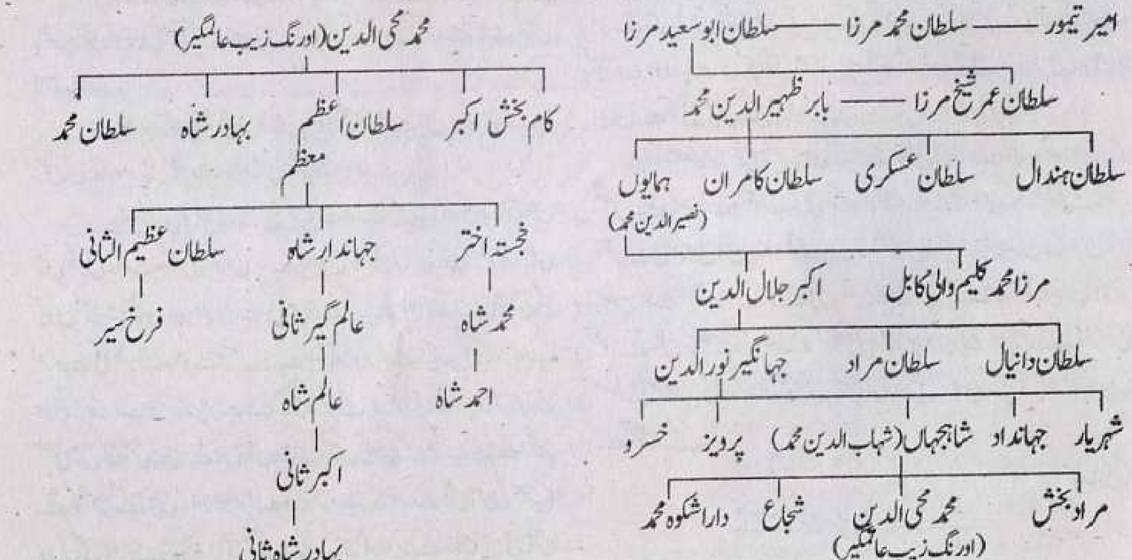
ترجمہ: لوح محفوظ اولیاء اللہ کے سامنے ہوتی ہے، جو کچھ وہاں پر محفوظ ہے وہ خطا سے غلطی سے پاک ہے۔ حضرت نعمت اللہ شاہ ولی کشمیری ایک عظیم اللہ والے گزرے ہیں، جفر کا علم تو حضور کا غلام تھا۔ یہ آپ کی ادنیٰ کرامت ہے کہ حضور نے آج سے آٹھ سو سال پیش تر پیش گوئی ارشاد فرمائی اور وہ حرف بہ حرف پوری ہوتی چلی آرہی ہے۔ بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضور نے تقریباً دو ہزار اشعار سپردِ قلم کیے ہیں جن میں سے راقم الحروف کے پاس دو سو ازتالیس اشعار ہیں۔ بعض کی ردیف "مے بینم" اور بعض کی ردیف "پیدا شود" ہے اور بعض قافیہ بیانہ، میزانہ، یگانہ وغیرہ رکھتے ہیں۔ آپ مختلف شہروں میں سیاحت فرماتے ہوئے کشمیر تشریف لائے اور وہیں وصال فرمایا۔ انگریزوں کے متعلق مندرجہ ذیل شعر حضور نے ارشاد فرمایا:

صد سال حکم ایشاں بر ملک ہند میداں — آرید اے عزیزاں، ایں نکتہ از بیانہ

تو لارڈ کرزن نے اس پیشین گوئی کو ممنوع قرار دے دیا کہ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہماری حکومت صرف سو سال ہندوستان میں رہے۔ اشعار عام طور پر ملنے مشکل ہو گئے، لیکن محبانِ اولیاء اللہ اشعار کی حفاظت کرتے رہے، قلمی بیاضوں میں، سینوں میں، ذہنوں میں کلام محفوظ چلا آیا۔

چناں چہ راقم الحروف کے ذہن میں ایک عرصہ سے خیال پیدا ہوا کہ ان اشعار کو یک جا کر کے طباعت کرائی جائے تاکہ یہ مجموعہ محفوظ ہو جائے۔

## شجرہ نسب حکومت مغلیہ








راست گویم بادشاہے در جہاں پیدا شود
نام او تیمور شاہ صاحب قراں پیدا شود

ترجمہ: میں سچ کہتا ہوں کہ ایک بادشاہ دنیا میں پیدا ہوگا، اس کا نام تیمور شاہ ہوگا اور وہ صاحب قراں ہوگا۔

ازروے تاریخ تیمور شاہ ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ان دنوں محمد تغلق ہندوستان پر حکمراں تھا۔ چناں چہ محمد تغلق جان بچا کر بھاگا اور شکست ہوئی۔ تیمور شاہ ہندوستان پر قابض ہو گیا، پھر ہند سے زر کثیر لے کر واپس سمرقند چلا گیا۔ دہلی کے گرد و نواح میں ۱۴۱۲ء میں فوت ہوا۔

بعد ازاں میران شاہ کشورستاں گردد پدید
والیٔ صاحب قراں اندر زماں پیدا شود

ترجمہ: اس کے بعد میراں شاہ سلطان محمد مرزا کشورستان (دنیا) میں ظاہر ہوگا اور یہ اس زمانے میں صاحب قراں تیمور شاہ کا والی ہوگا۔

چوں کند عزم سفر او از فنا سوئے بقا
بعد ازاں احوال شاہِ انس و جاں پیدا شود

ترجمہ: جب وہ مقام فنا سے بقا کی طرف عزم سفر کرے گا تو اس کے بعد انسانوں اور جنوں کا بادشاہ ظاہر ہوگا، یعنی سلطان ابو سعید مرزا جو بہادر بھی ہوگا اور طاقت ور حکمراں بھی ہوگا۔

بعد ازاں گردد عمر شاہانِ شاہ مالک رقاب
گردد آں ہم مدعی بس مہرباں پیدا شود

ترجمہ: اس کے بعد عمر شیخ شہنشاہ مالک رقاب ہوگا۔ وہ بھی دعوی کرنے والا ہوگا اور بہت مہربان ہوگا۔

بعدہ گردد عمر ش شیخ مالک ایں زمیں
درمیانِ عیش و عشرت بے گماں پیدا شود

مصرعہ ثانی بھی اسی عمر شیخ کی شان میں جلوہ گر ہے۔

ترجمہ: اس کے بعد عمر شیخ اس زمین کا مالک ہوگا، وہ بے گمان عیش و عشرت کے درمیان ظاہر ہوگا۔

شاہ بابر بعد ازاں در ملک کابل بادشاہ
پس بہ دہلی والی ہندوستاں پیدا شود

ترجمہ: شہنشاہ بابر اس کے بعد کابل کا بادشاہ پھر دہلی میں ہندوستان کا والی ظاہر ہوگا۔

از سکندر چوں رسد نوبت بہ ابراہیم شاہ
ایں یقیں داں فتنہ در ملک آں پیدا شود

ترجمہ: جب سکندر سے ابراہیم بادشاہ تک نوبت پہنچ جائے گی تو اس بات کو یقین سے سمجھ کہ اس کی بادشاہی میں فتنہ ظاہر ہوگا۔

امیر تیمور کا مقرر کردہ نائب سید خضر شاہ اور اس کے بعد تین دیگر جانشین علاؤ الدین تک برائے نام بادشاہ ہندوستان کے رہے۔ پس ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۱ء تک یہ خاندانِ سادات حکمراں رہا۔ لودھی خاندان کی حکومت ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۱ء تک رہی۔

باز نوبت از ہمایوں مے رسد از ذوالجلال
ہم در آں افغاں یکے از آسماں پیدا شود

ترجمہ: پھر ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے بادشاہی ہمایوں تک پہنچے گی۔ اس دوران قدرت کی طرف سے ایک افغان ظاہر ہوگا۔

ظہیر الدین محمد بابر، امیر تیمور کی پانچویں پشت سے تھا۔ بابر پانچ مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ آخر کار دولت خان حاکم پنجاب اور رانا سانگا والی میواڑ نے ابراہیم لودھی سے ناخوش ہو کر بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ بابر نے موقع غنیمت جان کر ۱۵۲۶ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور چار لڑائیاں لڑنے کے بعد پانچویں مرتبہ فاتح ہوا۔ اس کی حکومت ۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۰ء تک رہی۔

حادثہ رو آورد سوئے ہمایوں بادشاہ
وانکہ نامش شیر شاہ اندر جہاں پیدا شود
چوں رود در ملکِ ایراں پیشِ اولادِ رسول
تا کہ قدر و منزلش از قدر داں پیدا شود
شاہِ شاہاں مہربانی ہا کند در حق او
باوقار عز تش چوں خسرواں پیدا شود
تا زمانے آں کہ او لشکر بیارد سوے ہند
شیر شاہ فانی شود پسر ش بر آں پیدا شود

ترجمہ: ہمایوں بادشاہ کو حادثہ پیش آئے گا۔ اور اس کا نام شیر شاہ ہوگا، وہ دنیا میں ظاہر ہوگا۔ ہمایوں ملک ایران میں جائے گا پیغمبر کی اولاد کے پاس تاکہ اس کی قدر و منزلت قدر دانوں والی جماعت سے ظاہر ہو تو شہنشاہ اس کے حق میں مہربانی فرمائے گا تاکہ اس کی عزت و وقار ایک حکمراں کی حیثیت سے ظاہر ہو، جب

تک وہ ہندوستان پر لشکر کشی کرے گا۔ شیر شاہ مر گیا ہو گا اور اس کا بیٹا اس کی جگہ ظاہر ہو گیا ہو گا۔

شیر شاہ جو حسن خاں جاگیر دار کا لڑکا تھا، صوبہ بہار کا منتظم تھا، پھر یہ سوتیلی ماں کے سلوک سے تنگ آکر حاکم بہار کا ملازم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ اسی وجہ سے ۱۵۴۰ء میں ہمایوں شیر شاہ پر حملہ آور ہوا، لیکن شکست کھائی، پس شکست خوردہ ہو کر ایران کی حکومت میں پناہ گزیں ہوا۔ پھر ۱۵۴۵ء میں ایران کی امداد سے کابل اور قندھار فتح کیا اور ۱۵۵۵ء میں ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کیا۔ اس کی حکومت ۱۵۳۰ء سے ۱۵۵۶ء تک رہی۔

پس ہمایوں بادشاہ بر ہند قابض مے شود
بعد ازاں اکبر شہِ کشور ستاں پیدا شود

ترجمہ: اس طرح ہمایوں بادشاہ ہندوستان پر قبضہ کر لے گا، اس کے بعد اکبر ملک کا بادشاہ ظاہر ہو گا۔ جلال الدین محمد اکبر ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک تخت نشیں رہا۔

بعد ازاں شاہِ جہانگیر است گیتی را پناہ
ایں کہ آید در جہاں بدرِ جہاں پیدا شود

ترجمہ: اس کے بعد جہانگیر عالم پناہ ہو گا۔ یہ تخت پر جلوہ گر ہو گا تو مہتابِ کامل کی طرح ظاہر ہو گا۔

جہانگیر نور الدین محمد ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۷ء تک تخت نشیں رہا۔

چوں کند عزمِ سفر آں ہم سوے دار البقا
ثانیِ صاحب قراں شاہِ جہاں پیدا شود

ترجمہ: جب وہ دار البقا کی طرف سفر کرے گا تو صاحبِ قراں یعنی شاہ جہاں ظاہر ہو گا۔

بیش تر از قرن کمتر از چہل شاہی کند
تا کہ پسرش خود بہ پیشش آں زماں پیدا شود

ترجمہ: قرن سے زیادہ اور چالیس سال سے کم بادشاہی کرے گا، جب اس کا بیٹا اس کے سامنے ہی تخت پر جلوہ افروز ہو گا۔

فتنہ ہا در ملک آرد نیز بس گردد خراب
از عجائب ہا بود گر آب و ناں پیدا شود

ترجمہ: اس کے عہد میں فتنہ و فساد ہو گا اور ملک کی حالت بہت خراب ہو جائے گی۔ اس وقت آب و نان میسر ہونا بھی موجب حیرت ہو گا۔

در تحیر خلق ماند چوں چنیں گردد جہاں
مشتری از آسماں آتش فشاں پیدا شود

ترجمہ: جب دنیا میں اس طرح ہو جائے گا تو خلقت پریشان ہو جائے گی۔ آسمان سے مشتری آگ برسانے والا ظاہر ہو گا۔

ہم چناں دو عشر باشد بادشاہی او کند
تا ز فرزندان او کوچک بداں پیدا شود

ترجمہ: اس طرح بیس سال تک وہ بادشاہی کرے گا حتی کہ اس کے بیٹوں میں سے چھوٹا لڑکا اس پر ظاہر ہو گا۔

او بزور پر کند آواز خود اندر جہاں
والیِ ایں خلق عالم بے گماں پیدا شود

ترجمہ: وہ اپنی آواز کو دنیا میں قوت کے ساتھ بھر دے گا، وہ اس جہان کی خلقت کا والی بے گماں ظاہر ہو گا۔

شاہ جہاں شہاب الدین محمد کی حکومت ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک رہی۔ اس کے دو لڑکے دارا شکوہ اور اورنگ زیب تھے۔ ان کے درمیان فسادات برپا ہوئے اور آپس میں بد سلوکی ہوئی۔ رعایا بھی دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ۱۶۵۰ء میں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان زبردست جنگ ہوئی جس میں دارا فرار ہوا۔ اورنگ زیب نے اس کی گرفتاری کی جد و جہد جاری رکھی۔ بالآخر سندھ کے افغان جاگیر دار ملک جیون خان نے روپے کے لالچ میں آکر دارا کو اورنگ زیب کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ جب دارا دہلی پہنچا تو مفتیانِ وقت نے اس پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور دارا قتل کیا گیا۔ اورنگ زیب عالم گیر محی الدین کی حکومت ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء تک رہی۔

اندر آں اثنا قضا از آسماں گردد پدید
واں کہ نام او معظم در جہاں پیدا شود

ترجمہ: اسی اثنا میں آسمان کی طرف سے ایک فیصلہ ظاہر ہو گا، معلوم ہو کہ اس کا نام معظم ہو گا، وہ دنیا میں ظاہر ہو گا۔

بہادر شاہ معظم ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک حکمران رہا۔

خلق گردد جمع در دورانِ او گردد اماں
بر جراحت ہاے عالم مرہم آں پیدا شود

ترجمہ: اس دوران میں خلقت جمع ہو جائے گی اور امن و امان ہو جائے گا، جہاں کے زخموں پر وہ مرہم کی طرح ظاہر ہو گا۔

.......................(جاری)



بساطِ دعوت

# بر صغیر میں صوفیاے کرام کا منہجِ دعوت

محمد اکرم ساجد۔ پاکستان

**بر صغیر** ہند و پاک میں اشاعتِ اسلام کا سہرا صوفیاے کرام کے سر ہے۔ صوفیا کی کوششوں کا ذکر کیے بغیر بر صغیر کی اشاعت اسلام کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی، لیکن جن حالات میں صوفیا نے اشاعتِ اسلام کا کام سر انجام دیا اسے وہی شخص جان سکتا ہے جسے ہندوستان کی اخلاقی اور معاشرتی حالت کا کماحقہ علم ہو۔ دیوتاؤں کی حد سے بڑھتی ہوئی کثرت، جنسی خواہشات کی بحرانی کیفیت، طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات کی لعنت کے دور میں توحید پرستی کا درس، ضبطِ نفس کی تلقین اور انسانی وحدت و اخوت کا پیغام جس جاں گسل اور صبر آزما محنت کا متقاضی ہے، اسے ہر شخص بخوبی جانتا ہے اور صوفیاے کرام نے یہی کچھ کیا۔ دلوں میں ایک خدا کے لیے جذبۂ عبادت و محبت، کردار میں پاکیزگی و عفت اور انسانوں کے مختلف طبقات میں وحدت و مؤدت پیدا کر کے صوفیا نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ (۱)

ابو الحسن ندوی کے بقول: "ہندوستان میں مسلمانوں کے دور کا آغاز صوفیاے کرام ہی کی آمد سے ہوا۔" (۲)

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی کا کہنا ہے کہ: "اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہندی مسلمانوں کی قابلِ لحاظ تعداد نے انھیں صوفیا کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں انھیں بزرگوں نے دین کی روشنی پھیلائی۔" (۳)

ہندوستان میں تبلیغ کا سب سے زیادہ کام خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے سر انجام دیا اور آپ کے خلفا کی بے پناہ کوششوں سے ہندوستان کا چپہ چپہ نور اسلام سے منور ہو گیا۔ آپ کی تبلیغ کے اثرات مسلمانوں میں آج بھی موجود ہیں اور لوگوں کے دل آپ کی عقیدت سے معمور ہیں۔ (۴)

خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ تبلیغ اس قدر وسیع اور مؤثر تھا کہ ہندوستان کا کوئی کونا ایسا نہیں رہا جہاں آپ کے خلفا نہ پہنچے ہوں اور اسلام کی تبلیغ کا حق ادا نہ کیا ہو۔ بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ، دونوں نے اس معاملے میں جس دلچسپی اور انہماک کا مظاہرہ کیا، بر صغیر کا ہر مسلمان ان کا ممنون ہے۔ گجرات، دکن اور بنگال میں جو بزرگ اسلام کا پیغام لے کر گئے ان میں مولانا حسام الدین ملتانی، مولانا کمال الدین، شیخ برہان الدین غریب اور مولانا سراج الدین عثمان رحمہم اللہ تعالیٰ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب بزرگ خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا میں سے ہیں۔ (۵)

اسلام کے فروغ اور دین کی تبلیغ کے لیے صوفیاے کرام کا منہجِ دعوت کیا تھا، یہ جاننے کے لیے "آبِ کوثر" کا درج ذیل اقتباس ہدیۂ قارئین ہے:

"پاک و ہند میں اسلام زیادہ تر صوفیاے کرام نے پھیلایا، لیکن ان کا مطمحِ نظر اور طریقِ کار دورِ حاضر کی مشنریوں اور مبلغوں سے بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو فقط غیر مسلموں میں اشاعتِ اسلام کے لیے وقف نہ کر رکھا تھا بلکہ ان کے دروازے ہر ایک کے لیے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، امیر ہو یا غریب، کھلے تھے اور ان کا کام ہر ایک میں بلا کسی تفریق کے ارشاد و ہدایت تھا۔ ایک ہندو کے قبولِ اسلام سے انھیں جتنی خوشی ہوئی، شاید ایک مسلمان کے ترکِ گناہ سے ہوتی۔ صوفیا کے اس جامع نقطۂ نظر کو "سلسلۃ الذہب" کے مصنف نے ایک مشہور سہر وردی بزرگ (شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ) کا ذکر کرتے ہوئے خوب واضح کیا اور ان کی نسبت لکھا ہے:

لوگوں کی ارشاد و ہدایت میں کفر سے ایمان کی طرف، گناہ سے عبادت کی طرف، نفسیات سے روحانیت کی طرف ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ مشائخ کبار کے سامنے یہی مطمحِ نظر تھا جو "سلسلۃ الذہب" کے بیان کے مطابق شیخ بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ وہ ہر ایک کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایک بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیتے اور اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ کفار اسلام کی طرف راغب ہوتے اور عام مسلمان ایک پاک اور بے عیب زندگی کی طرف۔" (۶)

صوفیاے کرام کے منہجِ دعوت میں جو نمایاں خصوصیات نظر آتی ہیں، ذیل میں ان کا بالاختصار تذکرہ کیا جاتا ہے:

**۱- حسن اخلاق:-** صوفیاے کرام کے منہج دعوت میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کا حسن اخلاق ہے۔ حسن اخلاق صرف صاف ستھرا لباس پہننے کا نام نہیں، اچھی سوسائٹی میں بیٹھنے کا نام نہیں، کوئی ملنے آئے تو اس کے احترام میں کھڑے ہونے کا نام نہیں، صرف خندہ پیشانی سے پیش آنے کا نام نہیں، صرف نرم و شیریں گفتگو کا نام نہیں بلکہ اخلاق حقوق العباد کو پورا کرنے اور خدمتِ خلق کا نام ہے۔ اخلاق سراپا ایثار اور قربانی کا نام ہے، اخلاق بندگانِ خدا کی ہمدردی اور خیر خواہی کا نام ہے، مخلوق خدا کی نفع رسانی اور راحت رسانی کا نام ہے۔ خود ننگے بھوکے رہنے اور دوسروں کو پہنانے اور کھلانے کا نام ہے، زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کا نام ہے، معاشرے میں کم مرتبہ لوگوں کی عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کا نام ہے، غربا، ضعفا اور ہر ملنے والے کی دل جوئی کا نام ہے، کسی کی دل شکنی نہ کرنے کا نام ہے، حلم و برداشت اور در گزر کا نام ہے، صوفیا نے انھیں چیزوں کو اپنی زندگیوں کا مشن اور مقصودِ حیات بنایا۔ (۷)

معلّمین اخلاق کی صف میں سید کونین ﷺ سب سے نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ." ترجمہ: "اور بے شک آپ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں۔" (۸)

حضور ﷺ کی ذات تمام کمالات کی جامع ہے، وہ کمالات جو پہلے نبیوں اور رسولوں میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے، وہ مجموعی طور پر اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں اور اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ اس ذات اقدس و اطہر میں موجود ہیں۔ شکر نوح، خلّتِ ابراہیم، اخلاصِ موسیٰ، صدقِ اسماعیل، صبر یعقوب اور تواضع سلیمان علیہم الصلاۃ والسلام سب یہاں موجود ہیں۔ (۹)

شبلی نعمانی لکھتے ہیں: "حضرت رسالت پناہ ﷺ کی حیات اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آکر آپ ﷺ کی زندگی تمام انبیاے کرام اور مصلحین سے ممتاز نظر آتی ہے۔" (۱۰)

حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے حسن اخلاق کے باعث راہِ حق میں پیش آنے والی جملہ مشکلات و مصائب کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا، یہ آپ ﷺ کے حسن اخلاق ہی کی برکت تھی کہ قلیل عرصہ میں دور دور تک اسلام کا اجالا پھیل گیا۔ صوفیاے کرام نے اپنے آقا و مولا محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں اپنی تبلیغی مہموں میں حسن اخلاق کو نمایاں اہمیت دی ہے۔ اگر صوفیاے کرام کی تبلیغی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے تو حسن اخلاق کے گلستاں جگہ جگہ کھلے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد اکرم لکھتے ہیں: "تبلیغ دین کے لیے ان کا نہایت مؤثر ذریعہ ان کا اعلیٰ اخلاق تھا۔ وہ صدق و صفا کے پیکر اور محبت و اخوت کے مظہر تھے۔ عوام سے ان کا تخاطب نہایت لطیف اور دل نشیں تھا۔" (۱۱)

حافظ محمد سعد اللہ رقم طراز ہیں: "صوفیاے کرام کے پاس سب سے بڑا طاقت ور اور مؤثر ہتھیار حسن اخلاق، نرمی، خود غرضی سے پاک مخلوقِ خدا کی محبت، سچی ہمدردی، ہر ایک کے لیے دل سوزی اور غم خواری تھی جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر اور متاثر کرتے گئے۔ ان کے دلوں میں نیکی کا بیج بوتے گئے اور اس طرح اپنے حسن اخلاق سے اشاعت اسلام، تقویٰ، توبہ، رجوع الی اللہ اور نیکی کی ترویج میں وہ خدمات سر انجام دیں کہ بڑے بڑے خلفا بھی وسائل کے باوجود ایسی دینی خدمات سر انجام نہ دے سکے۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ نگہ کی تیغ بازی وہ سپہ کی تیغ بازی

تاریخ گواہ ہے کہ یہ کام نہ علما سے ہو سکا، نہ متکلمین سے، نہ حکما سے، نہ فقہا سے، یہ کام اگر ہو سکا تو ان بوریہ نشینوں، گدڑی پوشوں، ان نفوسِ قدسیہ سے جن کو صوفیاے اسلام کہا جاتا ہے اور جن کا نام آج بھی لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں میں عقیدت اور محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔" (۱۲)

حسن اخلاق کا دائرہ بڑا وسیع ہے ذیل میں چند ذیلی سرخیوں کے تحت برصغیر میں صوفیاے کرام کے منہج دعوت کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

**۲- ہمدردی و خیر خواہی:-** برصغیر میں صوفیاے کرام کی تبلیغی مہموں میں ہر انسان سے بے پناہ ہمدردی اور خیر خواہی کے انوار چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولانا ضیاء الدین برنی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اشراق کے وقت سے چاشت تک آپ علیہ الرحمہ کی جاں بخش اور روح پرور گفتگو سننے میں مشغول رہا۔ اس روز بہت سے بندگانِ خدا سلطان المشائخ کی خدمت میں بیعت سے مشرف ہوئے۔ اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ مشائخ سلف مرید کرنے میں نہایت احتیاط کرتے تھے اور خوب





غور و تامل کے بعد کسی کو مرید کر لیا کرتے تھے۔ سلطان المشائخ انتہا درجہ کے کرم اور مہربانی کی وجہ سے عام و خاص کی دست گیری کرتے اور بغیر امتحان و امتیاز کے لوگوں سے بیعت لیتے۔ میرے دل میں آیا کہ آپ سے اس بارے میں دریافت کرنا چاہیے، لیکن چوں کہ حضور مکاشفِ عالم تھے، فوراً میرے اس خطرہ سے واقف ہو گئے اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے: "مولانا ضیاء الدین تم ہر بات کو مجھ سے دریافت کرتے ہو، لیکن کبھی یہ نہیں پوچھتے کہ میں بغیر تحقیق کیے آنے والوں کو بیعت کے سلسلہ میں کیوں داخل کر لیتا ہوں اور بغیر تفتیش ہر شخص کے ہاتھ میں دستِ بیعت کیوں دے دیتا ہوں؟"

سلطان المشائخ کی یہ بات سن کر میں سر سے پاؤں تک لرز گیا اور حضور کے قدموں میں گر کر عرض کیا کہ عرصہ سے یہ مشکل اور دشواری مجھے در پیش تھی۔ فرمایا کہ سنو: "خدا تعالیٰ نے ہر زمانے میں اپنی حکمتِ بالغہ کی ایک خاصیت پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے کے آدمیوں کا طریقہ اور رسم و رواج علاحدہ ہوتا ہے اور ہر زمانے کی رفتار لوگوں میں اس درجہ اثر کرتی ہے کہ زمانۂ موجودہ کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت گزشتہ لوگوں کے طبائع سے بالکل مشابہت نہیں رکھتے، البتہ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعتیں پہلے لوگوں کی طبیعتوں سے ملتی جلتی ہیں اور یہ بات تجربات سے خوب واضح ہوتی ہے۔ جب اس قدر معلوم کر چکے ہو تو یہ بھی معلوم کرو کہ مرید کی اصل ارادت یہ ہے کہ وہ غیر حق سے قطع تعلق کر کے مشغول بہ حق ہو جائے۔

سلف کا قاعدہ تھا کہ جب تک مرید میں انقطاعِ کلی نہ دیکھتے تھے اس کے ہاتھ میں دستِ بیعت نہ دیتے تھے، لیکن شیخ ابو سعید ابو الخیر علیہ الرحمہ کے زمانے سے شیخ سیف الدین باخرزی علیہ الرحمہ کے عہد تک اور شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمہ کے عہدِ مبارک سے حضرت شیخ فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز کے زمانے تک ایک اور ہی طریقہ نے جلوہ گری کی تھی۔ ان اولو العزم اور جلیل القدر بادشاہوں کے دروازوں پر ہر وقت ہجوم خلائق رہتا تھا اور چار طرف سے بادشاہ، امرا، مشاہیر اور دیگر لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اخروی ہلاکت کے خوف سے اپنے تئیں ان عاشقانِ خدا کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ یہ مشائخ بغیر تحقیق و تفتیش کے عام و خاص سے برابر بیعت لیتے تھے اور سلسلۂ ارادت میں داخل کرتے تھے اور ہر ایک شخص کو حسب مراتب خرقۂ توبہ یا خرقۂ تبرک عنایت فرماتے تھے، کیوں کہ یہ ممکن نہ تھا کہ محبوبانِ خدا کا سا معاملہ ہر شخص کے ساتھ برتا جاتا، پس شیخ ابو سعید ابو الخیر، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ فرید الحق والدین قدس اللہ اسرارہم لوگوں کو اس طرح مرید کیا کرتے تھے جس طرح کہ میں کرتا ہوں اور اس زمانے کے موافق یہی بات ٹھیک ہے، کیوں کہ اگر خدا تعالیٰ کا ایک محبوب اور پسندیدہ شخص ایک جہاں کے گنہ گاروں کو اپنے سایۂ حمایت میں لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ اب میں تمہارے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ سنو! میں جو مریدوں سے بیعت لینے میں احتیاط اور تفتیش نہیں کرتا، اس کی چند وجہیں ہیں:

ایک یہ کہ میں سنتا ہوں کہ بہت سے لوگ میری بیعت میں داخل ہونے سے معصیت و گناہ سے باز رہتے ہیں، نماز با جماعت ادا کرتے ہیں اور نوافل میں مشغول رہتے ہیں۔ اگر میں پہلے ہی سے ارادت کی شرط و قیود ان سے بیان کروں اور ان شرائط کے بجا لانے پر مجبور کروں، نیز خرقۂ توبہ اور خرقۂ تبرک جو خرقۂ ارادت کے قائم مقام ہیں، نہ دوں تو اس قدر بھلائیاں جو ان سے ظہور میں آتی ہیں، وہ ان سے محروم و بے نصیب رہیں۔ دوسرے مجھے شیخ سے اس بات کی اجازت ہے کہ بغیر کسی سفارش، التماس یا وسیلہ کے اور بغیر کسی تفتیش اور کرید کے لوگوں سے بیعت لوں اور جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان آدمی عجز و اضطراب اور مسکنت و بے چارگی کے ساتھ میرے پاس آتا اور کہتا ہے کہ میں تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں تو مجھے اس سے بیعت لینے میں کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے؟ خاص کر جب کہ میری نیت میں اس کے صادق ہونے کا غالب احتمال ہوتا ہے، پس ایسی صورت میں مجھے اس سے بیعت لینا ضروری ہو جاتا ہے، قطع نظر اس کے کہ میں نے نہایت ثقہ اور راست باز لوگوں سے سنا ہے کہ جو لوگ میری ارادت و بیعت میں داخل ہوتے ہیں وہ تمام گناہوں سے الگ ہو جاتے ہیں۔" (۱۳)

اس سے پتہ چلا کہ حضرت سلطان المشائخ کے دل میں لوگوں کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، نیز آپ کس خوبی سے زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھتے تھے۔

خلیق احمد نظامی، خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی علیہ الرحمہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی علیہ الرحمہ چاہتے تھے کہ مسلمان رسولِ عربی ﷺ کے آئینے میں اپنے اخلاق و عادات کو

سنواریں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اچھے فضائل اور عادات صرف متابعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی پیدا ہوتے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اسی جد و جہد میں وقت گزارا کہ عوام کے اعمال درست کیے جائیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں آدمی بہت ہیں، لیکن آدمیت نہیں۔"

ملفوظات "نافع السالکین" میں جگہ جگہ بری صحبت، غیبت، غرور، عیب جوئی، شراب نوشی اور رشوت خوری سے بچنے کی ہدایت کی ہے اور بار بار ادب، مہمان نوازی، نیکی، عجز و انکسار اور ایمان داری کا درس دیا ہے۔[14]

اس اقتباس سے حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کی عوام کے لیے ہمدردی اور خیر خواہی نمایاں ہے۔

**۳- عفو و درگزر:-** صوفیاے کرام کو اپنی تبلیغی مہموں کے دوران اپنے مخاطبین کی طرف سے بعض اوقات بڑے ناخوش گوار واقعات کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا تھا۔ ایسے حالات میں وہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے بڑے موثر انداز میں اپنی دعوت کو اپنے مخاطب کے دل و دماغ میں اتار دیا کرتے تھے۔

امیر خورد "سیر الاولیا" میں خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"ایک دفعہ آپ کے چند معتقدین مل کر سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہر ایک نے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مختلف قسم کی مٹھائیاں خریدیں۔ ان میں ایک دانش مند بھی تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا یہ مختلف تحائف سلطان المشائخ کی خدمت میں یکجا پیش کروگے؟ انھوں نے کہا: ہاں! اس نے تھوڑی سی خاک راستے میں سے اٹھائی اور ایک کاغذ میں لپیٹ لی۔ جب یہ سلطان المشائخ کے پاس پہنچے تو ہر ایک نے اپنا تحفہ آپ کے سامنے رکھا اور اس دانش مند نے بھی وہ کاغذ کی پڑیا آپ کے سامنے رکھی۔ آپ کے خادم نے وہ تحائف اٹھانے شروع کیے، خادم نے چاہا وہ کاغذ کی پڑیا بھی اٹھا لے، مگر سلطان المشائخ نے فرمایا کہ اس پڑیا کو یہیں رہنے دو کہ یہ خاص ہماری آنکھوں کے لیے سرمہ ہے۔ وہ دانش مند فوراً تائب ہوا۔ سلطان المشائخ نے خلعتِ خاص سے سرفراز کیا اور اس سے فرمایا: اگر تمھیں وظیفے یا روٹی کی ضرورت ہو تو ہم سے کہو۔"[15]

دیکھا آپ نے کہ کس طرح حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ نے عفو و درگزر سے کام لے کر اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ حضرت شاہ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کسی کو رنجیدہ یا ملول نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر آنے والے کی دل جوئی کرتے تھے اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ آپ کے پاس سے کوئی شخص رنجیدہ خاطر نہ جائے۔ آپ کے اخلاق سے دشمن تک متاثر ہوتے تھے۔ لوگ آپ کی جان لینے کی فکر میں جاتے لیکن جب آپ سے ملتے تو بقول مصنف "مناقب فخریہ"۔

اے برتر از سپہر و مہ و مہر جاہ تو
گردن کشاں مسخر تیر نگاہ تو

ایک افغانی آپ کی خانقاہ میں آیا اور آپ پر حملہ کیا۔ خدام نے ہاتھ پکڑ لیے۔ آپ نے فرمایا: ہاتھ چھوڑ دو اور اپنا سر مبارک زمین پر ڈال کر فرمایا:

"ما حاضریم ہر چہ بخاطر شماست بکنید۔"

ترجمہ: "ہم حاضر ہیں جو کچھ تمہارے جی میں ہے کرو۔"

وہ شخص اس وقت شرمندہ ہو کر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد دو آدمیوں کو اور اپنے ساتھ لایا، اس کو دیکھتے ہی آپ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: صاحب بخیر و عافیت! ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ اخلاق کا وہ ہتھیار جو پہلی بار اچٹتا ہوا لگا تھا اپنا کام کر گیا اور ان لوگوں نے سچے دل سے معافی مانگی۔[16]

حضرت قبلہ عالم (پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری) قدس سرہ العزیز بعطائے الٰہی حسن اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ کافر بھی آپ کے اخلاقِ حسنہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتے تھے اور ہزاروں لاکھوں متزلزل الیقین مسلمان آپ کے رفق و ملاطفت اور رافت و شفقت کے گرویدہ ہو کر صالح اور دین دار بن جاتے تھے۔ خلافِ شریعت کوئی بات آپ ہرگز برداشت نہ کر پاتے۔ اگر کوئی مخالفت شریعت سے باز نہ آتا تو آپ عملی طور پر سختی فرماتے اور یہ سب اللہ، رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت کی خاطر ہوتا۔ ذاتی طور پر آپ مجسم رافت و شفقت تھے۔ ایک دفعہ ایک عورت اپنے چھت پر کھڑی ہوئی زور زور سے گالیاں بک رہی تھی۔ آپ نے فرمایا: یہ کس کو برا بھلا کہہ رہی ہے؟ غور فرمایا تو وہ آپ ہی کی شانِ اقدس میں ہرزہ سرائی کر رہی تھی۔ ارشاد فرمایا: دروازہ بند کرو، اللہ اس کو ہدایت دے۔ اس وقت آپ کی خدمت میں بہت سے لوگ حاضر تھے، وہ سب کرم و رافت کے اس عظیم مظاہرے سے بے حد متاثر ہوئے۔

در حقیقت حضرت قبلۂ عالم رحمۃ اللہ علیہ "اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ





رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ۔" (سورۃ الفتح آیت ۴۸) کی صحیح مثال تھے۔

گوجراں والہ کے خطیب مولوی عبد العزیز صاحب فالج زدہ ہو گئے۔ ان کی بیماری نے طول کھینچا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غلطیوں اور گستاخیوں کی معافی طلب کی۔ حضرت قبلۂ عالم رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: مولوی صاحب مجھے آپ سے کوئی ذاتی رنجش نہیں ہے، نہ ہی مجھے آپ کی کوئی بات یاد ہے، البتہ آپ نے حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی شانِ مبارک میں گستاخیاں کی ہیں، اس لیے آپ اللہ تعالیٰ سے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی طلب کیجیے، میں بھی آپ کے لیے دعا کروں گا۔ اس کے بعد مجھے طلب کیا اور حکم دیا: مولوی صاحب بیمار ہیں، ان کا علاج کراؤ، ان کی تیمار داری اور خدمت گزاری کرو، مولوی صاحب کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ مولوی صاحب آپ کے خلق و کرم سے بے حد متاثر ہوئے، اپنی غلطیوں اور قصوروں سے تائب ہوئے اور فلاحِ دارین حاصل کی۔[17]

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے احوال میں درج ہے:

ایک بار ایک بدظن آدمی حضرت خواجہ صاحب کو قتل کرنے کے ارادہ سے آیا، حضرت خواجہ صاحب کو اس کا علم نورِ باطن سے ہو گیا، لیکن وہ شخص جب نزدیک آیا تو بہت ہی اخلاق سے پیش آئے اور اپنے پاس بٹھا کر فرمایا کہ جس ارادہ سے آئے ہو اس کو پورا کرو۔ یہ سنتے ہی وہ شخص کانپنے لگا اور شرمندہ ہو کر عاجزی سے بولا کہ مجھے لالچ دے کر آپ کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یہ کہہ کر چھری نکالی اور سامنے ڈال دی، پھر قدم مبارک پر گر کر کہنے لگا کہ آپ مجھے اس کی سزا دیجیے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہم درویشوں کا شیوہ ہے کہ ہم سے کوئی برائی بھی کرتا ہے تو ہم اس کے ساتھ نیکی سے پیش آتے ہیں، تم نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ یہ کہہ کر اس کے لیے دعا کی۔ وہ آدمی بہت متاثر ہوا اور اسی وقت سے خدمت میں رہنے لگا اور حضرت کی بدولت اس کو ۴۵ بار زیارتِ بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی اور اس مقدس سرزمین میں پیوندِ خاک ہوا۔ خواجہ غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس دیارِ غیر میں سب سے بڑا اور موثر ہتھیار یہی تیغ اخلاق تھی، جس نے اہلِ ہند کے قلوب کو فتح کیا اور "سلطان الہند" کے لقب کا تاج ان کے سر پر سجایا۔ اسی حسنِ اخلاق سے اپنے پرائے سب ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتے گئے اور خواجہ صاحب نے ان کا رخ بت خانوں سے مساجد کی طرف موڑ دیا۔"[18]

مفتی انتظام اللہ شہابی حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے احوال میں درج کرتے ہیں:

"ایک روز حضرت خواجہ مع مصاحبین رونق افروز تھے کہ راجہ پتھورا کے لشکر کا ایک آدمی آستین میں چھری چھپائے ہوئے آیا اور معتقدین کی طرح بیٹھ کر طالبِ بیعت ہوا۔ خواجہ صاحب بار بار اس کی طرف دیکھتے تھے اور مسکرا دیتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے فرمایا کہ درویش کے پاس کسی شخص کا آنا دو وجوہ سے خالی نہیں ہوتا، یا تو آنے والا بخیالِ بیعت آتا ہے یا بخیالِ اذیت۔ تو بھی ان میں سے جو بات سوچ کر آیا ہے کر گزر۔ یہ سنتے ہی اس شخص نے چھری آستین سے نکال کر سب کے سامنے پھینک دی اور قدموں پر گر پڑا اور معافی کا طالب ہوا۔ آپ نے اس کو مسلمان کر کے مرید کیا اور کاملین میں اس کا شمار ہوا۔"[19]

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں "تذکرہ صوفیاے پنجاب" میں لکھا ہے:

"ایک بار ایک بہت بڑا عالم دانش وربخارا سے دہلی آیا۔ جب وہ ملتان پہنچا تو اپنے علمی پندار اور رعونت کی وجہ سے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے نہیں گیا۔ جب وہ ملتان سے دہلی روانہ ہونے لگا تو اس کے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ اسے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملنا چاہیے۔ آخر وہ اپنے ساتھیوں کے اصرار پر آپ کی خدمت میں اس شان سے حاضر ہوا کہ دستار کا شملہ نیچے تک لٹکا ہوا تھا اور لمبے لمبے بال شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔ آپ نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا: دو دو سانپ لے کر آئے ہو۔ اس ارشاد کے ساتھ ہی اس کی رعونت دور ہو گئی اور اس نے اسی وقت اٹھ کر سر منڈایا اور دستار کے شملے کو چھوٹا کیا اور آپ سے بیعت ہو کر ایک عرصے تک آپ کی خدمت میں رہا۔"[20]

ڈاکٹر اعجاز انجم لطیفی پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"آج کے مریدین ہر طرح کے ہوتے ہیں، با ادب بھی اور بے ادب بھی۔ آپ مریدین کی اصلاح اور تربیت میں فراخ دلی کے ساتھ بڑی برداشت اور عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔ کچھ مشائخ اپنے مریدین کو ڈانٹتے اور مارتے بھی ہیں، کچھ مشائخ اپنے مریدین سے

ملازموں اور نوکروں کا سا برتاؤ کرتے ہیں لیکن آپ کا ہر معاملہ ہی نرالا ہے، مریدین آپ کی محبت سے قریب آتے چلے جاتے ہیں۔ "(۲۱)

(جاری)

## حوالہ جات


۱. گیلانی، خورشید احمد، صاحب زادہ، روح تصوف، خزینۂ علم و ادب، لاہور، اشاعت پنجم، ۲۰۰۱ء، ص: ۸۴-
۲. ندوی، ابو الحسن علی، ربانیۃ لا رہبانیۃ، اردو ترجمہ بنام تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، مترجم محمد الحسنی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، اشاعت اول ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء، ص: ۹۴-
۳. محمد ادریس، مضامین تصوف، دوست ایسوسی ایٹس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۸۴
۴. سعید اختر، پروفیسر، انوار اولیاءاللہ، مجید بک ڈپو، لاہور، ص: ۶-
۵. روح تصوف، ص: ۸۸- ۸۹-
۶. محمد اکرام شیخ، آبِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، اشاعت یازدہم ۱۹۸۶ء، ص: ۱۹۰- ۱۹۱-
۷. محمد سعد اللہ، حافظ، صوفیاء اور حسن اخلاق، اقبال پبلشنگ کمپنی لاہور، اشاعت دوم، جون ۱۹۹۹ء، ص: ۳۱- ۳۲-
۸. سورۃ القلم ۶۸: ۴-
۹. الازہری، محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت ۱۹۹۵ء، ج: ۵، ص: ۳۳۱-
۱۰. شبلی نعمانی، سیرت النبی ﷺ، الفیصل ناشران و تاجران، کتب، لاہور، مارچ ۱۹۹۱ء، ج: ۲، ص: ۱۷۲-
۱۱. محمد اکرم، ڈاکٹر، تعارف "آثار الاولیا" کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص: ۷-
۱۲. صوفیا اور حسن اخلاق، ص: ۸۹- ۹۰-
۱۳. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ندوۃ المصنفین، دہلی، اشاعت اول مئی ۱۹۵۳ء، ص: ۲۸۸- ۲۹۲-
۱۴. ایضاً، ص: ۲۲۹- ۲۳۰-
۱۵. امیر خورد کرمانی، سیر الاولیا، اردو ترجمہ، اعجاز الحق قدوسی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، اشاعت اول، اپریل ۱۹۸۶ء، ص: ۲۶۰- ۲۶۱-
۱۶. تاریخ مشائخ چشت، ص: ۴۸۳- ۴۸۴-
۱۷. اختر حسین، سید پیر: سیرت امیر ملت، امیر ملت پبلی کیشنز لاہور، اشاعت چہارم، محرم الحرام ۱۴۲۰ھ / مئی ۱۹۹۹ء-
۱۸. صوفیا اور حسن اخلاق، ص: ۱۷۰-
۱۹. مفتی انتظام اللہ شہابی، ماہ تابِ اجمیر، مصطفائی پریس، آگرہ، ص: ۲۵- ۲۶-
۲۰. اعجاز الحق قدوسی، تذکرہ صوفیائے پنجاب، سلمان اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۶۶
۲۱. ڈاکٹر اعجاز انجم لطیفی، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد (حیات، علمی اور ادبی خدمات) ضیاء الاسلام پبلی کیشنز، کراچی، اشاعت اول، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۲ء، ص: ۸۵-


☆☆☆

(ص: ۱۰ کا بقیہ) وہ تیری بکریاں اور تیری لونڈی تجھے واپس کر دی جائے گی اور تیرے لڑکے پر حد لگے گی۔

جس کوڑا کے ساتھ مارا جائے وہ نہ زیادہ سخت ہو نہ زیادہ نرم اور حد جسم کے ایک حصے پر ہی نہ لگائی جائے، بلکہ منہ، سر اور شرم گاہ کے علاوہ جسم کے مختلف حصوں پر لگائی جائے۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ایسے حاکم کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا، جس نے حد میں کمی کی ہوگی اس سے پوچھا جائے گا: "لم فعلت ذلک." "تو نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا: "رحمۃ لعبادک" "تیرے بندوں پر رحمت و شفقت کے لیے۔ اسے کہا جائے گا: "أأنت ارحم بهم منی." "کیا تو مجھ سے زیادہ ان پر رحم کرنے والا ہے؟" "فیومر بہ إلی النار." "اسے دوزخ میں پھینک دینے کا حکم دیا جائے گا۔ پھر ایسے حاکم کو پیش کیا جائے گا جس نے مقررہ حد سے ایک کوڑا زیادہ مارا ہوگا، اس سے اس کی وجہ پوچھی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "أنت أحکم بہ منی، فیومر بہ إلی النار." "کیا تو مجھ سے زیادہ حکم کرنے والا ہے، پھر اسے بھی آگ میں پھینکے جانے کا حکم صادر ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کی صحیح طور پر تعمیل میں ہی ہماری فلاح ہے۔ اپنی خود ساختہ مصلحتوں کے پیش نظر ان میں کمی یا زیادتی کرنا خطرناک نتائج کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں بھی حدود کے قیام میں تساہل کیا گیا، جرائم میں ہوش ربا اضافہ ہوا۔ قتل کی وارداتوں میں آئے دن جو زیادتی ہو رہی ہے اس کی بڑی وجہ یہی فعل مذموم ہے۔ جب اس شخص کی دادرسی نہیں ہوئی جس کی عصمت لوٹ لی گئی تو وہ جوشِ غضب سے مغلوب ہو کر خود انتقام لینے کے لیے بڑھتا ہے اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دیتا ہے، اس لیے رافت اور مہربانی یہ نہیں کہ ایک جان بچانے کے لیے بیسیوں جانیں تلف کرنے کا دروازہ کھول دیا جائے۔

کیوں کہ سزا کا ایک اہم مقصد دوسروں کو عبرت دلانا ہے، اس لیے حکم دیا کہ یہ حد مجمع عام میں قائم کی جائے تاکہ عام لوگ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور مجتنب رہیں۔ جب کوئی شخص حد قائم کرنے کے باعث مر جائے تو اس کی نعش کی تذلیل اور توہین نہیں کی جائے گی بلکہ عام مسلمانوں کی طرح غسل دیا جائے گا، کفن پہنایا جائے گا، نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

"اذا مات فی الحد یغسل و یکفن و یصلی و یدفن فی مقابر المسلمین." (تفسیر کبیر)



اصلاح معاشرہ

# تصوف اور تعمیر سیرت

محمد افضل الدین جنیدی

اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے: وعبادالرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا و اذا خاطبھم الجھلون قالوا سلاما۔ (سورہ فرقان، پارہ: ۱۹)

"اور رحمٰن کے وہ بندے کہ زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں بس سلام۔"

حسرت موہانی کہتے ہیں۔

مرا ایماں عجب کیا ہے جو ایمان تصوف ہے
تصوف جانِ مذہب عاشقی جانِ تصوف ہے

تصوف کو قرآن حکیم میں علم لدنی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: و علمناہ من لدنا علما. (الکہف، ۱۵- ۶۵)

"اور اسے اپنا علم لدنی عطا کیا۔"

"علم لدنی" کی تفسیر میں صاحب روح البیان لکھتے ہیں کہ "یہ وہ علم ہے جو اس بندے کو نصیب ہوتا ہے جو اپنے اعضا کو مخلوق کے تعلقات سے فارغ کر دے۔ بلکہ اپنی جمیع ارادت اور حرکات و سکنات کو فنا کر دے اور اپنے آپ کو ہر تمنا اور آرزو سے فارغ کر کے بارگاہ حق کے سپرد کر دے۔" یعنی اپنے ذات سے تمام صفات رذیلہ کو صفات حسنہ میں تبدیل کرنے کے علم کو "علم لدنی" کہتے ہیں جس سے انسان کا ظاہر و باطن اور سیرت و صورت آراستہ ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی حدیث احسان میں ہے کہ:

"الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"

"احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تجھے یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم یہ خیال کر کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔"

کیفیتِ احسان جو دو حالتیں "مشاہدہ" و "مراقبہ" پر مبنی ہے۔ یقین کی دولت مشاہدہ سے حاصل ہوتی ہے اور ایمان کو مشاہدہ حق تک پہنچا دینا "مرتبۂ احسان" کہلاتا ہے۔ جس کے حصول کا ذریعہ "تصوف و طریقت" ہے۔

تصوف و احسان ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی موضوع کے دو عنوان ہیں۔ احسان قلب و باطن کی وہ لطیف و روحانی کیفیت ہے جو عبادت کا مقصود ہے اور اسے حاصل کرنے کا طریقہ "تصوف" کہلاتا ہے۔ احسان بس کیفیات کا اجمالی ذکر ہے۔ "تصوف" اس کی تفصیل ہے۔

لفظ احسان کا مادہ "حُسن" ہے جس کے معنٰی "عمدہ و خوبصورت ہونا" کے ہیں۔ یعنی ظاہر و باطن کے حسن سے مزین ہو جانا احسان کہلاتا ہے۔ جس کا قرآنی نام "تزکیہ" اور اُس کے حصول کے طریقے کا عُلم "علم لدنی" علم معرفت، علم باطن، علم تصوف و سلوک کہلاتا ہے۔ احسان (تصوف) اور صاحب احسان (صوفی) کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ثم اتقوا وامنو ثم اتقوا واحسنوا واللہ یحب المحسنین." (المائدہ)

"پھر ڈریں اور ایمان رکھیں، پھر ڈریں اور نیک رہیں اور اللہ نیکوں کو دوست رکھتا ہے۔"

احسان کی اس اعلیٰ حالت و کیفیت کا راستہ تصوف و سلوک کا راستہ کہلاتا ہے جس میں سالک اپنے باطن کو آراستہ کر کے اپنے اخلاق و سیرت کو آراستہ کرتا ہے اور اخلاق الٰہی کا ظہور اُس کی ذات سے ہوتا ہے۔ احسان کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) احسان مع الخالق (خالق کے ساتھ احسان کا تعلق)
(۲) احسان مع الخلق (مخلوق کے ساتھ احسان کا تعلق)

بندے کا جب اللہ سے تعلق حسین تر ہو جائے، وہ احکاماتِ الٰہی و حقوق الٰہی کو بدرجۂ احسن ادا کرے اور اُس کا دل محبت الٰہی و خشیت الٰہی سے سرشار ہو تو "احسان مع الخالق" کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

بندہ جب اللہ کی مخلوق کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے اپنے تعلق کو حسین بنالے اور اللہ کے بندوں کے ساتھ اس کا معاملہ حسن عمل پر مبنی ہو وہ سراپا ایثار و قربانی بن کر ہمیشہ دوسرے کا کام آئے اسی ایثار کے عمل کو ''احسان مع الخلق'' کہتے ہیں۔ احسان پر مبنی تعلق خواہ اللہ کے ساتھ ہو یا اس کی مخلوق کے ساتھ دونوں اعتبار سے ایک عظیم عمل ہے۔ اس عمل سے سیرت و اخلاق میں نکھار اور کشش پیدا ہوتی ہے۔ اسی اعلیٰ اخلاق کا نام ''تصوف'' ہے۔ حقیقتِ تصوف تمام تر حسنِ نیت، حسنِ احوال، حسنِ اخلاق، حسنِ اعمال سے عبارت ہے۔

شیخ ابوبکر الکتانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''تصوف سراپا اخلاق ہے، جس نے کسی خُلق کا اضافہ کیا اس نے تصوف میں اضافہ کیا۔''

چنانچہ حضرت علامہ انوار اللہ فاروقی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں، حضرت امام جعفر صادق کا قول ہے کہ: من عاش فی ظاهر الرسول فهو سنی و من عاش فی باطن الرسول فهو صوفی.

یعنی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر پر زندگی گذارے وہ سنی ہے اور جو باطن رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر زندگی بسر کرے وہ صوفی ہے۔

حسن خلق میں ہی تعمیر سیرت مضمر ہے، جو روح تصوف ہے۔ سیرت و اخلاق کی تعمیر میں عفو و درگذر، صبر و تحمل، قناعت و توکل، خوش خلقی و مہمان نوازی، تواضع و انکساری، خلوص و محبت جیسے اوصاف قابل ذکر ہیں۔ اور یہی اوصاف و احوال و آداب ہیں جو ذاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ نے مجھے بہتر ادب و اخلاق سکھایا۔''

اور ایک مقام پر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

"بعثت لاتمم مكارم الاخلاق ومحاسن الافعال"۔

''میں اخلاق کو بزرگی تک پہنچانے کے لیے اور اعمال میں حسن پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

اور اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندی اخلاق کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔ وانك لعلى خلق عظيم۔

''اور بے شک تمہارے اخلاق عظیم ہیں۔''

تصوف ہی ایک علم ہے جو کیفیت و حال کی صورت میں انسان کے سیرت و اخلاق کی تعمیر کرتا ہے۔ صوفیائے کرام نے تصوف کو اخلاق سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا چند اقوال صوفیا ملاحظہ ہو، جس میں بتایا گیا ہے کہ اخلاق و سیرت کو مزین کرنے کا اگر کوئی علم ہے تو وہ علم تصوف ہے۔

سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ نے غنیۃ الطالبین میں فرمایا کہ:
''بعض نے تصوف کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ کے ساتھ سچے دل سے معاملہ رکھے اور خوش اخلاق ہو۔''

حضرت ابوالحسن کا قول ہے کہ: ''تصوف نہ کسی اسم کا نام ہے نہ علوم کا بلکہ یہ اخلاق ہے۔''

حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''التصوف حسن الخلق'' (تصوف حسنِ اخلاق کا نام ہے)۔

حضرت ابوعلی قریق نے فرمایا: ''تصوف اخلاق حسنہ اور کردار پسندیدہ کا نام ہے اور بندہ ہمیشہ حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتا ہے۔''

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری فرماتے ہیں کہ: ''اگر کوئی تصوف کی حقیقت کا انکار کرتا ہے تو یہ ساری شریعت پیغمبر علیہ السلام کا انکار ہے اور آپ کے اخلاق پسندیدہ کا انکار ہے۔''

ابومحمد جریری نے فرمایا: ''تصوف ہر اعلیٰ اخلاق میں داخل ہونے اور ذلیل حرکات سے نکلنے کا نام ہے۔''

محمد بن علی قصاب کا قول ہے کہ: ''تصوف وہ کریمانہ اخلاق ہے جو کریم زمانہ میں کریم آدمی سے کریم لوگوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے۔''

کتانی کا قول ہے کہ: ''تصوف اخلاق حسنہ کا نام ہے، جس کے اخلاق تم سے بہتر ہوں گے وہ صوفی ہونے میں بھی تم سے بہتر ہوگا۔''

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں: ''تصوف کے معنی ہیں تہذیب، اخلاق، تزکیۂ نفس اور ماسوئ اللہ کی طرف التفات ترک کرتے ہوئے مولائے کریم کی بارگاہ کا قرب و وصول حاصل کرنا۔''

ان صوفیائے کرام کے اقوال سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ تصوف اعلیٰ اخلاق کا نام ہے۔ حضرت جنید بغدادی نے فرمایا کہ:

''آٹھ اخلاق اپنانے والا صاحب تصوف ہے۔''

اور وہ یہ ہیں:-

(۱) سخاوت۔ (۲) رضا۔
(۳) صبر۔ (۴) اشارہ (مناجات)۔
(۵) غربت۔ (۶) گدڑی۔
(۷) سیاحت۔ (۸) فقر۔





جو آٹھ نبیوں کی اقتدا میں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسی ''سخاوت''۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح قضا پر ''رضا''۔

حضرت ایوب علیہ السلام جیسا ''صبر''۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی طرح ''اشارہ'' (مناجات)۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسی ''غربت و مسافرت''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ''گدڑی کا لباس''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ''سیر و سیاحت''۔

عالم قدس کے بادشاہ حضرت محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کا ''فقر''۔

یہ آٹھ اخلاقِ انبیا ایسے تابناک اخلاقِ حمیدہ ہیں جن کو اختیار کرنے سے سیرت کی ظاہری و باطنی تعمیر ہوتی ہے۔ ان اخلاق سے مزین انسان کو ''صوفی'' کہا جاتا ہے۔

صوفیائے کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم اخلاق و آداب کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنایا۔ صاحبان تصوف کی سیرت و اخلاق نکھارنے و سنوارنے کے لیے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں جن کو وہ اخلاق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرتے ہیں۔ تمام اخلاق حسنہ کا حصول احکاماتِ شریعت کے آداب بجا لانے میں مضمر ہے۔ اور تمام آداب تعلیماتِ تصوف میں مضمر اور پوشیدہ ہیں۔

حضرت ابوحفص حداد نیشاپوری فرماتے ہیں:

''تصوف سراسر ادب ہے۔ ہر وقت ہر مقام اور ہر حال کے متعین آداب و احکام ہیں۔ جس نے ان آداب کی پابندی کو ان اوقات میں لازم رکھا وہ مردانِ خدا کے درجے پر فائز ہوگئے۔ اور جس نے ان آداب کی پابندی کو ملحوظ خاطر نہ رکھا اور اُسے رائیگاں کردیا وہ قرب حق کے خیال اور قبول حق کے گمان سے محروم رہ گیا۔''

گویا کہ معین وقت میں جو کام رکھا گیا اسی وقت اُسی کام کا کرنا ادب ہے۔ اور یہی ادب تصوف و طریقت کی اصل ہے، جب یہ آداب انسانی زندگی میں آجاتے ہیں تو ایک عام انسان صوفیانہ سیرت کا حامل بن جاتا ہے اور عرف عام میں اسے صوفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیوں کہ انہیں آداب بجالانے سے قرب خداوندی کی نعمت عطا ہوتی ہے۔

استاذ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں کہ ''بندہ اللہ کی عبادت کرنے سے جنت تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کی اطاعت میں ادب بجالانے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔''

اس لیے صاحبانِ تصوف کے پاس سفر، حضر، اوقات، عادات، اخلاق اور سکون و حرکت کے اپنے مخصوص آداب ہیں جن کی بنا پر اُن کی سیرت، اُن کے اخلاق عام انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

تمام صفاتِ حمیدہ جن کو اخلاق حسنہ کہا جاتا ہے، تصوف و صوفیانہ نظام سے ہی ان کا حصول ہوتا ہے۔ جو سیرت کی تعمیر میں ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ چند اخلاق حسنہ یہ ہیں:-

صدق یعنی سچائی، احسان، تواضع، امانت، ایفائے عہد، صبر، حلم، عفو و درگذر، استقامت، حیاء حق گوئی، رحم و شفقت، صلہ رحمی، قناعت، نیک اعمال اور ایثار و قربانی وغیرہ۔

مندرجہ بالا اخلاقِ حسنہ و اوصافِ حمیدہ کو اگر آج بھی انسان اپنالے تو وہ دنیا و آخرت میں کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔

## مآخذ و مراجع

(۱) غنیۃ الطالبین: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، ترجمہ: امان اللہ خان ارمان سرحدی۔
(۲) فتوح الغیب: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، شرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔
(۳) رسالہ قشیریہ: ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری۔
(۴) حقیقتِ تصوف: پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری۔
(۵) کشف المحجوب: حضرت سید علی بن عثمان الجویری۔
(۶) کتاب اللمع: شیخ ابونصر سراج، مترجم: سید اسرار بخاری۔
(۷) تعلیمات اسلام (احسان): ماخوذ از افادات، پروفیسر طاہر القادری۔
(۸) تفسیر روح البیان: حضرت اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۹) مقاصد اسلام (حصہ پنجم): فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ فاروقی بانی جامعہ نظامیہ حیدرآباد۔

☆☆☆☆

# اسلام اور سیاست

مولانا اکبر علی قادری

سیاست کے لغوی معنی حکومت کرنا، رعیت پر تنبیہ کرنا، اور لوگوں کو بہ وسیلہ خوف و سزا گناہ اور جرم سے روکنا، حکمتِ عملی اور حکومت کے کاروبار وغیرہ ہے۔

(لغاتِ کشوری، ص: ۳۰۰، ۴۴، فیروز اللغات، فرہنگ آصفیہ جلد دوم)

اول الذکر معنی کے اعتبار سے آج کے دور میں سبھی حکومت کرتے ہیں اور کامیاب سیاست کرتے ہیں اور موخر الذکر کے اعتبار سے بھی تقریباً سارے ممالک حکومت کے کاروبار سنبھالے ہوئے بہترین سیاست کرتے ہیں، لیکن اوسط الذکر کے میزان سے دیکھا جائے تو وہ ممالک جو ممالکِ اسلامیہ کہے جاتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ کم از کم وہ تو ایک مثالی سیاست کرتے تاکہ دنیا اس سے سبق حاصل کرتی مگر افسوس! کہ جس مذہب نے دنیا کو سیاست کا ہنر سکھایا، آج اسی دین کے پیروکار مغربی سیاست و تمدن کے شکار ہو گئے۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے سیاست کا وجود نہیں تھا، ہر گز نہیں، نظامِ سیاست تو تھا، ہاں! وہ سیاست جس سے معاشرے کی تشکیل اور اصلاح ہوتی ہے، امن و سکون کا ماحول ہوتا ہے، بالکل ناپید سی تھی۔ بلکہ اسلام کے جلوہ بار ہونے کے باوجود بھی دیگر مذاہب والے اسلامی سیاست کی کماحقہ نقل نہ کر سکے۔

میرے قول کی تصدیق بین الاقوامی سیاست پر نظر ڈالنے سے ہو جائے گی، اسلامی قرونِ اولیٰ کے سیاسی نظام کا موازنہ دیگر مذاہب کے نظامِ سیاست اور موجودہ سیاست سے کیا جائے تو کئی ایک واضح باتیں سامنے آتی ہیں۔ آپ دیکھیں کہ وہ قوم جو آج اپنے آپ کو ترقی یافتہ شمار کراتی ہے، اس کا یہ عالم تھا کہ صلیبی جنگوں کے دوران "پاپائے روم" جو کہ کیتھولک فرقے کا سب سے بڑا پادری تھا، اس نے حکم جاری کیا تھا کہ جو لوگ اس مذہبی معرکہ میں شریکِ جنگ نہیں ہو سکتے وہ کسی کو اپنی طرف سے بھیج دیں اور اس کے بدلے انھیں معافی نامہ دے دیا جائے گا جو ان کی نجات کا کفیل ہوگا۔ جب لیو دہم روما نے روما میں سینٹ پیٹر (Saint Pastor) کا گرجا بنوانا چاہا تو اس نے بھی اس قسم کے معافی نامے بھیجنے شروع کیے۔ پھر کیا تھا! ان معافی ناموں نے عام تجارت کی صورت اختیار کر لی۔ ہر مقام پر ان معافی ناموں کی ایجنسیاں قائم ہو گئیں۔ سولہویں صدی میں اس تجارت نے ایک طوفانی صورت اختیار کر لی۔ ہر گناہ کی معافی کے لیے الگ الگ فارم ہوا کرتی تھی۔ معافی ناموں کی عام فارم (Form) ہوا کرتی تھی، نیز کلیساؤں سے مذہبِ عیسائی کے پیروکاروں کو یہ مژدۂ جاں فزا سنایا جاتا تھا۔

"تم پر خدا کے بیٹے یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ تمھیں اپنے مقدس ترجسم سے (تمام گناہوں کی پاداش سے) آزاد کرائیں گے۔ اور میں تمھیں پطرس، بوس اور مقدس پوپ کی اس سند کی رو سے جو انھوں نے مجھے عطا فرمائی ہے، آزاد کرتا ہوں۔ سب کو کلیساؤں کی تمام ملامتوں سے خواہ کسی شکل کی ہوں پھر تمہارے ہر گناہ کی شفاعت اور جرم کی قباحت خواہ وہ کیسے ہی مہیب ہی کیوں نہ ہوں میں وہ سزا تم سے اٹھا لیتا ہوں جو تمھیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی تاکہ جب مرو تو جہنم کے دروازے بند ہوں اور جنت کے اندر داخل ہو جاؤ۔ باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔"

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بتایا گیا ہے کہ ہر گناہ کی الگ الگ قیمتیں ہوا کرتی تھیں۔ قیمت کی شرح ملاحظہ ہو:

اسقاطِ حمل ۳/ شلنگ (Shilling)، عدالت میں جھوٹی قسم ۹/ شلنگ، چوری ۱۲/ شلنگ، کسی کی عصمت دری ۹/ شلنگ، زنا کی اور صورتوں میں ۵، ۷/ شلنگ، قتل میں ۷/ شلنگ ۴/ پنس، لونڈی رکھنے میں ۵، ۱۰/ شلنگ۔

واضح ہو کہ شلنگ انگریزی کے اس سکہ کو کہتے ہیں جو بارہ پنس کا ہوتا ہے۔ (فیروز اللغات، ص: ۴۵۳)

ان معافی ناموں کے ایجنٹ کچھ اس قسم کی آوازیں لگایا کرتے تھے:

"آؤ بڑھو! جنت کے دروازے کھل رہے ہیں اگر اب بھی نہ داخل ہوئے تو کب داخل ہو گے؟ تم بارہ پنس کے عوض میں اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ اگر تمہارے پاس کچھ اور نہیں، ایک کوٹ ہی فقط ہے تو وہی اتار دو تاکہ اسی قدر یہاں متاع حاصل کر سکو۔" (ڈکشنری)

نتیجہ وہی سامنے آیا جو ایک انسانی فطرت کا تقاضا ہے، یعنی





قوم گناہ پر دلیر ہو گئی۔ چناں چہ آکسفورڈ کا چانسلر (Chancellor) تھامس، گسلو تجن ص: ۱۴۵۰/ میں لکھتا ہے:

"آج کل گنہ گار ہر جگہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ میں اس کی کوئی پروا نہیں کرتا کہ میں خدا کے حضور کتنا گناہ کرتا ہوں، اس لیے کہ میں ہر وقت بلا دقت ہر گناہ اور جرم کے لیے معافی نامہ خرید سکتا ہوں محض چار پنس میں، اس لیے کہ معافی ناموں کے بیچنے والے ہر جگہ دکھائی دے رہے ہیں۔"

یہ خرابیاں اگر عوام تک محدود ہوتیں تو کہا جا سکتا تھا کہ عوام کا فعل کوئی سند نہیں کیوں کہ قوم کا ہر فرد مذہبی رموز اور ان کے نکات سے کماحقہ آشنا نہیں ہوتا۔

مگر حیرت تو یہ ہے کہ مندرجہ بالا خرابیاں خود مذہبی پیشواؤں کی ایجاد تھیں اور یہ مذموم حرکتیں نظامِ کلیسا کی بنیاد میں داخل تھیں۔ چناں چہ اس باب میں ڈاکٹر مانگ لکھتا ہے:

"جس عہد میں کلیسا سیاسی طور پر صاحبِ اقتدار رہا، وہی عہد سب سے زیادہ بد معاشیوں کے لیے بدنام رہا۔"

اس کو مینکون ان الفاظ میں دہراتا ہے:

"یونیورسل چرچ (Universal Church) کے اقتدار کا زمانہ درحقیقت بے مثال جرائم و بدنظمی، ظلم و تعدی اور فسادات و بدکاریوں کا زمانہ تھا۔"

(ماخوذ از ماہ نامہ جریدہ "المولوی"، بابت ماہ مئی ۱۹۵۵ء، ج: ۶۲، نمبر: ۳)

معلوم ہوا کہ جب سیاسی پیشوا اور ان کے ماتحت قوم گم راہ، بدکار اور نا اہل ہوں گے تو اس کا اثر ملک و ملت پر پڑنا لازم آتا ہے کیوں کہ برائیوں کا دفاع و خاتمہ خشیتِ ربانی و مذہبی اصول کی پابندی پر منحصر ہے اور مذہبی مبلغین ہی معصیت کے خوگر ہو جائیں تو تبلیغ و تعمیر چہ باشد؟

جیسا کہ میں نے گزشتہ تحریر میں کہا ہے کہ اسلام نے دنیا کو سیاست کا ہنر سکھایا۔ اس کا بنظرِ عمیق جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ اسلام ہی وہ سچا، پاکیزہ اور انسانی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا مذہب ہے جس نے بزبانِ نبوی اپنے پیروکاروں کو "الدین والملک توأمان۔" کا عظیم درس دیا ہے۔ کیوں کہ اسلامی سیاست کا حسین ترین نظام یہ ہے کہ اسلام نے سب سے پہلے گناہوں کی بنیادی جڑوں پر تیشہ لگایا اور پھر جم کر اُن کی مذمت کی اور اس پر سخت سزاؤں کا تعین کیا، مثلاً کذب ایک شنیع گناہ ہے تو اسلام نے سب سے پہلے اس کے خلاف آواز اٹھائی، شراب برائیوں کا سرچشمہ ہے تو اسلام نے حرام کہہ کر اس پر اسی درّے کی حد مقرر کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حرمتِ خمر کے موقع پر مدینۃ النبی میں شراب کی ندیاں بہہ نکلیں۔ رہے سہے عادت سے مجبور شرابی، حاکمِ وقت کو دیکھ کر اس کے رعب سے "توبۃ النصوح" کی دولت پانے لگے۔ زنا اگر قبیح جرم ہے تو اسلام نے زانی کے لیے سو کوڑے یا سنگ ساری کی عبرت ناک سزا مقرر کی۔ لواطت اگر بے حیائی ہے تو ایسے شخص کے لیے اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے ایسی ہول ناک سزا تجویز فرمائی کہ ارادۂ جرم کرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ چناں چہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت علی نے فعلِ بد کرنے والے اور کرانے والے دونوں کو جلا دیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دونوں پر دیوار گرا دی۔ اسی طرح اسلام نے دیگر برائیوں کے خاتمے کا مکمل انتظام فرمایا۔

اب ملکی نظام کی درستگی ملاحظہ ہو:

**اسلامی چناؤ:-** پیارے آقا ﷺ نے اپنے دورِ حیات میں کسی کو اپنا جانشیں نام زد نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے نے نبی اکرم ﷺ کی خوب صورت تربیت سے بخوبی یہ جان لیا تھا کہ اسلام ایک شوریٰ خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد نہ کسی خاندانی بادشاہت کی بنیاد ڈالی گئی، نہ کوئی شخص طاقت کے استعمال سے برسرِ اقتدار آیا، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ چناں چہ سب سے پہلے جنابِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے خلیفہ بنایا، پھر جب آپ برضائے الٰہی آمادہ سفرِ دارِ بقا ہوئے تو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت لکھوائی اور مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع فرمایا اور کہا: کیا تم لوگ اس شخص پر راضی ہو جسے میں اپنا جانشین بنا رہا ہوں۔ خدا کی قسم! میں نے رائے قائم کرنے کے لیے اپنے ذہن پر زور ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی اور اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں بلکہ عمر بن خطاب کو جانشیں مقرر کیا ہے۔ لہٰذا تم ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ اس پر لوگوں نے کہا، ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ اس طرح اسلام نے چناؤ اور عام انتخاب کا رواج قائم کر کے جمہوریت کو فروغ دیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر کی زندگی کے آخری سال حج کے موقع پر ایک شخص نے یہ آواز اٹھائی کہ حضرت عمر کے انتقال کے بعد میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ آخر حضرت ابو بکر کی بیعت بھی تو اچانک ہی ہوئی تھی، آخر وہ کامیاب ہو گئی۔ اس کی اطلاع حضرت عمر کو ہوئی تو مدینہ پہنچ کر اپنی پہلی تقریر میں قبیلہ بنی ساعدہ کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں ایسا نہ کرتا اور مسئلۂ خلافت کا تصفیہ

کیے بغیر ہم لوگ مسجد سے اٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ لوگ غلط اقدام کر بیٹھتے اور اس پر ہمارے لیے راضی ہونا بھی مشکل اور بدلنا بھی دشوار ہوتا اگر یہ فعل کامیاب ہوا تو آئندہ کے لیے نظیر نہیں بنایا جا سکتا۔ اب کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اپنے کو اور جس کے ہاتھ پر بیعت کیا دونوں اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کریں گے۔

حضرت عمر نے اپنے دورِ خلافت میں خود مختاری اور بغاوت کی ناپاک رسم کا قلع قمع کرکے جمہوریت کی ٹھوس بنیاد ڈالی۔ صحابۂ کرام کے نزدیک خلافت اور بادشاہت کا جو واضح فرق تھا اسے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"امارت یعنی خلافت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو۔ اور بادشاہت وہ ہے جسے تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا گیا ہو۔"

**عدالت اسلامی:-** فیصلے کے متعلق حضرت ابو بکر کا قاعدہ یہ تھا کہ پہلے دیکھتے اس معاملے میں کتاب اللہ کیا کہتی ہے، اگر وہاں کوئی حکم نہ ملتا تو دیکھتے رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے معاملہ میں کیا فیصلہ فرمایا ہے۔ پھر اگر سنتِ رسول سے بھی کوئی حکم نہیں ملتا تو قوم کے سرکردہ لوگوں کی جو رائے قرار پاتی اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے — اس معاملے میں ہر ایک کے لیے عام اجازت تھی کہ جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے یا اتفاق کرے، میں نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں — یہ حضرات اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ قانون کی نگاہ میں اپنے آپ کو اور مملکت کے عام شہری کو خواہ مسلمان ہو یا ذمی، مساوی قرار دیتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت اُبی بن کعب اور حضرت عمر کا ایک معاملے میں اختلاف ہو گیا اور دونوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا۔ جناب زید نے حضرت عمر کو اپنی جگہ بٹھانا چاہا لیکن حضرت عمر خود حضرت اُبی بن کعب کے ساتھ بیٹھے۔ حضرت اُبی بن کعب نے دعویٰ پیش کیا۔ حضرت عمر نے انکار کیا۔ ضابطے کے مطابق حضرت زید نے قسم لینی چاہی مگر انھوں نے تامل کیا۔ حضرت عمر نے قسم کھائی۔ مجلس کے خاتمے پر حضرت عمر نے کہا زید قاضی ہونے کے قابل نہیں۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک عیسائی کو کوفے کے بازار میں اپنی گم شدہ زرہ بیچتے ہوئے دیکھا، آپ امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے اپنی زرہ اس سے چھین نہیں لیتے بلکہ قاضی کے پاس استغاثہ پیش کرتے ہیں، لیکن حضرت علی کوئی گواہ اور شہادت نہ پیش کر سکے۔ قاضی نے آپ کے خلاف فیصلہ دیا، آپ بسر و چشم قبول کرتے ہوئے واپس لوٹ آئے۔

**خوش حالی کا انتظام:-** اسلام نے ملک کے انتظام و انصرام کو بہتر اور عوام الناس کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے ملک کو مختلف صوبوں میں تقسیم کرکے مختلف محکمے قائم کیے۔ سارے صوبے مرکزی حکومت کے تابع ہوا کرتے تھے اور ہر عامل کے لیے سخت احکام ہوا کرتے تھے کہ خبردار! کوئی حاکم اپنے اور رعایا کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹ کی دیوار حائل نہ کرے۔ نیز عاملوں کے گھر بھی عوام الناس کے محلوں میں ہوا کرتے تھے۔ ہر ایک کے لیے ہمہ وقت عامل کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ ان امور کا جائزہ خلیفۂ وقت بذاتِ خود وقتاً فوقتاً لیا کرتا تھا۔ حج کے موقع پر لوگوں کو اس بات کی اجازت ہوتی تھی کہ اگر کسی کو کسی عامل سے شکایت ہو تو بیان کرے، اس کی شکایت پر غور کیا جائے گا۔

**حاکم، رعایا اور عدل فاروقی:-** ایک مرتبہ حضرت عمر نے حج کے موقع پر تمام عاملوں کو طلب کیا اور مجمع عام میں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ ان لوگوں کے خلاف جس شخص کو کسی ظلم کی شکایت ہو، پیش کرے۔ پورے مجمع میں صرف ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے حضرت عمرو بن عاص کی شکایت کی کہ انھوں نے ناروا طریقے پر مجھے سو کوڑے لگوائے تھے۔ حضرت عمر نے کہا، اٹھو اور ان سے اپنا بدلہ لو۔ حضرت عمرو بن عاص نے احتجاج کیا کہ آپ گورنروں پر یہ دروازہ نہ کھولیں۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے پیارے آقا ﷺ کو اپنے آپ کا بدلہ دیتے ہوئے دیکھا۔ اے شخص! اٹھ اور اپنا بدلہ لے۔ آخر کار حضرت عمرو بن عاص کو ہر کوڑے کے بدلے دو اشرفیاں دے کر اپنی پیٹھ بچانی پڑی۔

**سیاست اسلامی کی خصوصیتیں:-**

اسلامی سیاست اور بین الاقوامی سیاست کا عمیق نظری سے مطالعہ کیا جائے تو نظامِ اسلامی میں اعلیٰ ترین خصوصیات میں سے چند خصوصیتیں ایسی ہیں جن کو اپنا لینے سے اس پر آشوب دور میں بھی خاطر خواہ نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

۱. اس میں تنقید اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی۔
۲. خلفا کا ہر وقت اپنی قوم کی دسترس میں ہونا۔
۳. نیز خود اہل شوریٰ کے درمیان بیٹھ کر حصہ لینا۔
۴. خلفائے اسلام کے زمانہ میں نہ ان کی کوئی سرکاری پارٹی تھی، نہ ان کے خلاف کسی پارٹی کا وجود تھا۔ خلفا کا عالم یہ تھا کہ اسلام کے اول ترین خلیفہ نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ اگر میں سیدھا نہ چلوں تو میری مدد کرنا، اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر نے جمعہ کے خطبے میں نکاح کے متعلق فرمایا: کسی کو نکاح میں چار سو درہم سے زائد مہر باندھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ایک عورت نے انھیں وہیں ٹوک دیا کہ قرآن ڈھیر سارے قنطار (مال) مہر میں دینے کی اجازت دیتا ہے، آپ اس کی حد مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ آپ فوراً اپنی بات واپس لیتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سخت تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے کبھی کسی کا منہ زبردستی بند کرنے کی کوشش نہ کی، بلکہ ہمیشہ اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب میں بر سرِ عام صفائی پیش کی۔ حضرت علی نے اپنے زمانۂ خلافت میں خوارج کی انتہائی بد زبانیاں بڑے ٹھنڈے دل سے برداشت کیں۔
۵. اس زمانے میں ٹھیک ٹھیک اسلامی اصول اور اس کی روح کے مطابق قبائلی و نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کے درمیان یکساں سلوک کیا گیا۔ چناں چہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں اپنے قبیلے کے کسی شخص کو حکومت کا کوئی عہدہ نہ دیا۔ حضرت عمر نے اپنے پورے زمانۂ خلافت میں اپنے قبیلے کے صرف ایک شخص کو جن کا نام نعمان بن عوی تھا ایک چھوٹے سے علاقے کا تحصیل دار مقرر فرمایا تھا، مگر تھوڑی ہی مدت میں معزول کر دیا۔

**زوال مسلم کے عوامل:-** جب تک ہماری قوم بیدار تھی ہم ہر میدان میں "مقدمۃ الجیش" ہوا کرتے تھے۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ کون سا علم ہے جسے مسلمانوں نے نہیں حاصل کیا، وہ کون سی ایجادات ہیں جو ان سے بچ رہیں۔ محمد بن موسیٰ وہ پہلا شخص ہے جس نے دنیا کو "کاہے" کا طریقہ بتایا، ابو الحسن نام کا ایک مسلمان تھا جس نے دور بین ایجاد کی۔ میر فتح اللہ نے سب سے پہلے ایسی بندوق بنائی جس سے بیک وقت بارہ آوازیں نکلتی تھیں۔ ایک انگریز تاریخ داں لکھتا ہے کہ عربوں کی تمام ایجاد میں بارود کی ایجاد سب سے بڑی ہے۔ بڑی جانچ پڑتال کے بعد یہ بات طے ہو گئی کہ عرب والوں نے ہی بارود اور توپوں کی ایجاد کی ہے۔ ہوائی جہاز بنانے والا اندلس کا رہنے والا ایک مسلمان ہی تھا جس کا نام ابو القاسم تھا۔ یہ شخص ہوائی جہاز بنا کر اس میں اڑا تھا مگر پوری کامیابی نہیں ہوئی تھی کہ وہ مر گیا۔ قطب نما مسلمانوں کی عطا اور دین ہے۔ ڈوبے جہاز کو نکالنے کا آلہ ایک عرب مسلمان کا کارنامہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ سارے علوم و فنون پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو سارے علوم و فنون مسلمانوں کی کاوشوں کی رہینِ منت ہیں۔

جب تک قوم میں ذی علم و ذی شعور پیدا ہوتے رہے ہم اقوامِ عالم کے لیے روشنی کے مینار تھے۔ لیکن جب سے ہم طریقِ رسول سے الگ ہوئے، بزدلی ہمارا مقدر بن گئی۔ بد اخلاقی ہمارا شعار ہو گئی۔ اسلاف کی راہوں سے بھٹکے تو روسیاہی ہماری تقدیر اور ذلت و رسوائی ہماری قسمت ٹھہری۔ کبھی ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ وہ جسے طارق بن زیاد، محمد بن قاسم جیسے اولو العزم نے قومی سرمایہ صرف کرکے حاصل کیا تھا، ہماری ناعاقبت اندیشی کے باعث سب چھن گئے۔ آج بھی ان کی روحیں قوم کے سربراہ اور فولادی قوت کے مالک جوانوں سے اپنے ایثار کی بے قدری کا جواب طلب کر رہی ہیں۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار۔" ہم سے اندلس چھین لیا گیا۔ افریقہ سے بے دخل ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان میں غلامی مقدر ہو گئی ہے۔ آج پوزیشن یہ ہے کہ بیت المقدس، بابری مسجد جیسی سیکڑوں مسجدوں کے تقدس کو پامال کیا جا رہا ہے اور ہم سراپا حسرت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ہماری بزدلی کا یہ عالم کہ ہمارا بھائی ہمارے ہی سامنے لہو لہان ہو رہا ہوتا ہے اور ہم منہ پھیر کر گزر جانے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔

وجہ کیا ہے؟ ہم کبھی عروج کی سربلندی پر فائز تھے اور آج مائل بہ پستی ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے اسلاف اخوت، اخلاق، صلہ رحمی، شجاعت، سخاوت، عدل، علم و فن، عشقِ رسول، خشیتِ خداوندی کے جواہرات سے مزین و آراستہ تھے اور آج ہم انھیں رتنوں سے محروم ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
آج ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

"خلافتِ راشدہ" کا دور ایک عظیم الشان دور تھا جسے دوبارہ دیکھنے کے لیے فقہا و محدثین اور قوم کا درد رکھنے والے دین دار مسلمانوں کی آنکھیں ترستی رہ گئیں اور شاید قیامت تک ترستی ہی رہیں گی۔ اگر ہم میں اب بھی کوئی عمر بن عبد العزیز جیسا ذی فہم پیدا ہو جائے تو یقیناً خلافتِ راشدہ کے دور کی جھلک دیکھ کر آنکھیں سکون حاصل کر سکتی ہیں۔

غلط روی سے منازل کا بعد بڑھتا ہے
مسافرو روشِ کارواں بدل ڈالو

☆☆☆

# سب سے بڑا مجرم کون؟...... میں؟ آپ؟ یاغریب لڑکی کا مجبور باپ؟؟

**عنبر مصباحی**

**عبدالقادر:** ماشاءاللہ آپ کی بچی بہت خوبصورت اور حسین صورت ہے۔ ہمیں آپ کی لڑکی پسند آئی۔ اللہ نے ہمیں مال ودولت سے سرفراز کیا۔ ولد صالح جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی۔ بس ایک بیٹی کی آرزو تھی اور اللہ وہ بھی آپ کے در سے پوری فرما رہا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہم جیسے کم نصیب کے بیٹے کو اپنی دامادی کے لیے منتخب کیا۔

**عبدالرحیم:** ارے آپ بلا وجہ شرمندہ کر رہے ہیں۔ شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ مجھ غریب کی بیٹی کو آپ نے اپنے ہونہار لڑکے کے لیے پسند کیا۔ یہ تو میری اور میرے خاندان کی معاشرتی معراج ہوگی کہ مجھ غریب کی لڑکی آپ کے عالی شان بنگلے کی عزت بنے گی۔

چلیے! یہ بتایئے کہ آپ کی کوئی مانگ یا فرمائش وغیرہ تو نہیں ہے؟

**عبدالقادر:** ارے آپ کیسی نا معقول باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں آپ کے در سے اتنی پاکیزہ طینت اور نیک فطرت بیٹی مل رہی ہے۔ یہی تو سب سے بڑا عطیہ ہے۔ اس سے بڑی مراد اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں اس عظیم نعمت الٰہی پہ خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت نیک بیوی ہے۔ چنانچہ ہمارا بھی تجربہ ہے کہ اگر بیوی اور بہو نیک ہوں تو گھر جنت ہے۔ ورنہ گھر کا ماحول مکدر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب ہمارے پڑوسی مجاہد الاسلام صاحب کو ہی لے لیجیے! ان کی بہو بہت تیز زبان اور اجڈ مزاج کی ہے۔ ان کا گھر ہمیشہ عراق و افغانستان بنا رہتا ہے۔ اس لیے وہ بے چارے ہمیشہ گھر سے باہر ٹھکانہ تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (اسی وقت اذان کی آواز آئی) چلیے عبدالرحیم صاحب! پہلے خدا کو یاد کر لیں پھر بقیہ باتیں کریں گے۔ (عبدالرحیم صاحب نے نماز عصر کے ساتھ دو رکعت نماز شکرانہ بھی ادا کی۔ اللہ عزوجل کا خوب خوب شکر ادا کیا اور ثنائے الٰہی بجا لائے کہ اس نے ان کی بچی کا رشتہ ایک اعلیٰ خاندان میں طے کر دیا۔ اور اس نے ایسے فرشتہ صفت لڑکے والے کو بھیجا ہے جو جہیز سے سخت نفرت وعداوت رکھتے ہیں۔ اللہ ان کی عمر لمبی فرمائے اور ان کا سایۂ عاطفت میری بچی پہ دراز فرمائے۔ آمین) نماز کے بعد تفریحی ناشتہ (SNACKS) چنا گیا۔ چائے نوشی کا دور چلا۔ اسی اثنا میں عبدالقادر صاحب یوں گویا ہوئے:

ہاں صاحب! تو بات چل رہی تھی جہیز کی۔ ہمیں کیا حاجت جہیز کی............؟؟ ہاں! البتہ آپ کی بچی گھر بیٹھی بور ہوگی تو ٹیلی ویژن کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ ہمارا لڑکا تو ہاسپٹل صبح جاتا ہے تو رات گئے واپس آتا ہے۔ اور ہم اپنے آفس سے عموماً رات گیارہ بجے کے بعد ہی لوٹتے ہیں۔ گھر میں صرف ہماری اہلیہ اور آپ کی بچی رہے گی تو کچھ حد تک اکتاہٹ ضرور ہوگی۔

**عبدالرحیم:** ہم نے ٹی وی، کولر اور فریج وغیرہ کا انتظام کر رکھا ہے۔ ہم نے یہ سب چیزیں دو تین سال قبل ہی خرید لی تھی۔

**عبدالقادر:** ماشاءاللہ آپ تو کافی ہوشیار اور زمانہ شناس لگتے ہیں۔ آپ نے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے ہی سے تیاری کر رکھی ہے۔ تب تو آپ نے چار پہیے والی گاڑی کا بھی انتظام کر رکھا ہوگا۔ کہاں ہے ذرا ہمیں دکھایئے تو سہی۔

**عبدالرحیم:** عبدالقادر صاحب ......! میں ایک غریب آدمی ہوں۔ ماہانہ پانچ سات ہزار کما لیتا ہوں اس سے میں چار پہیے والی گاڑی کا انتظام کہاں سے کر سکوں گا۔

**عبدالقادر:** تو آپ بائیک دینا چاہ رہے ہیں۔ ذرا سوچیے! آپ جیسے شریف اور مہذب شخص کی بیٹی بائیک سے میکے کیسے آیا کرے گی۔ فور ویلر سے سفر کرنے میں زیادہ آسانی اور شرافت ہے۔ ماشاءاللہ آپ کا یہ مکان بھی کافی وسیع وعریض اور عالیشان ہے۔ اگر آپ اس کے ایک حصے کو فروخت کر دیں تو آپ کی نور نظر پوری زندگی عیش وآرام میں گزارے گی۔ آپ فکر نہ کریں میں خود ہی خریدار ڈھونڈنے میں آپ کی مدد کروں گا۔ اور ہاں میں نے آپ سے اس بات کا تذکرہ کیا

javedambar@gmail.com





ہی نہیں کہ آپ کے ہونے والے داماد افروز اپنا ہاسپٹل کھولنا چاہ رہے ہیں۔ میرے پاس پانچ لاکھ تک ہیں اور اگر آپ تین چار لاکھ کی مدد کر دیتے ہیں تو ان شاءاللہ یہ کام بھی بہ آسانی ہو سکتا ہے۔

تقریباً یہی کہانی یہی منظر اور یہی سین ہندوستان کے مسلم معاشرے میں سال میں کم وبیش ایک لاکھ مرتبہ DISPLY ہوتا ہے جب لڑکی کا غریب باپ لڑکے کے باپ کے سامنے ایک مجرم کی طرح رحم کی درخواست کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر سال لاکھوں مسلم خاندان اپنی جوان بچی کی شادی کے لیے انہیں مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ جہیز کے بھیڑیے ہی طرح اپنی فرمائش لفظ "نہیں" سے شروع کر کے لاکھوں تک لے جاتے ہیں۔ جب پہلے "نہیں" کا لفظ ادا کرتے ہیں تو بیٹی والے کا دل خوشی سے عرب ساگر بن جاتا ہے اور اس کی دعاؤں کی لہروں میں اتنی طغیانی ہوتی ہے کہ اس کا شمار ممکن نہیں رہ جاتا ہے۔ شاید اس وقت وہ لڑکے والے کو خدا اور رسول کے سوا سب کچھ مان لیتے ہیں۔ مگر جب دو تین منٹ بعد شرافت کا میک اپ اترتا ہے تو ان کی لالچی شکل وصورت دیکھ کر لڑکی والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں "قل اعوذ برب الناس" کی تلاوت کر کے دو منٹ قبل دل سے نکلی دعا کے "ستیاناس" ہونے کا افسوس کرتے ہیں۔ اپنا سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ خوب گڑگڑاتے منتیں سماجتیں کرتے ہیں مگر ان "الماسی دلوں" پہ لفظ "اثر" یا لفظ "رحم" کا خیال بھی نہیں گزرتا ہے۔

چناں چہ حالات سے مجبور باپ اپنی بیٹی کی خوشنودی اور تابناک مستقبل کی خاطر اپنا سارا مال ودولت اور اپنی ساری پراپرٹی نیلام کر کے جہیز کے طلب گاروں کے جہنم جیسے وسیع "بطن" کے ہر کونے اور ہر گوشے کو بھرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ وہ اس "شکم نامسعود" کے ہر دروازے کو مال وزر سے بند کر دیں تا کہ اس سے "ھل من مزید" کا کوئی شعلہ نکل کر ان کی بیٹی کی خوشیوں کو خاکستر نہ کر سکے۔ لیکن شاید کوئی ایسا خفیہ یا چھوٹا سا دروازہ نگاہوں سے اوجھل رہ جاتا ہے جو لڑکی والوں کو نظر نہیں آتا ہے اور وہ بھر نہیں پاتا ہے، جس کے باعث چار چھ ماہ بعد اس سے ایک جہیز طلب انگارہ نکلتا ہے اور دلہن کو اپنی لپیٹ میں لے کر جلا دیتا ہے۔ جہیز کا ابلیسی ناگ ہر سال ہماری ہزاروں دختران اسلام کو نگلتا جا رہا ہے مگر ہم پتھر کا مجسمہ بنے خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم اپنے دونوں ہاتھوں کا حلقہ بنائے چین کی سانسیں لے رہے ہیں۔ جب کہ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

"اقتلوا الموذی قبل الایذاء"

ضرر رساں کو ضرر پہنچانے سے قبل ہی ختم کر دو۔

**جہیز کے مثبت پہلو** کسی بھی موضوع یا معاملے کے متعلق کچھ کہنے اور فیصلہ لینے سے قبل اس کے دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ جہاں اس کے منفی امور کو دیکھا جائے وہیں اس کے مثبت پہلوؤں کو بھی مد نظر رکھا جائے۔ دونو ں پہلوؤں کے فوائد ومضرات کو سامنے رکھ کر کوئی رائے قائم کرنے سے دُرستی و صواب کے امکانات زیادہ سے زیادہ رہتے ہیں۔ میری عقل نارسا جہیز کے ایک مثبت پہلو تک رسائی کر سکی ہے۔ جب دو افراد رشتۂ ازدواج میں پروئے جاتے ہیں تو انہیں گھر کے ہر سامان اور بہت سی مختلف چیزوں کی حاجت ہوتی ہے اور انہیں زر کثیر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اگر ان کی کچھ معاونت کر دی جائے تو ان کا بار کچھ کم ہو جائے گا۔ اور شاید اس وقت لڑکی والے سے زیادہ ان کا کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا ہے۔ اگر وہی کچھ مدد کر دیں تو بہتر ہے۔

مگر یہ بھی مخدوش ہے کیوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے 75 فیصد سے زیادہ افراد JOINT FAMILY کے طور پر رہتے ہیں۔ جن میں عمومی طور پہ سکونت اور مطبخ ایک ساتھ ہی رہتا ہے۔ اور والدین کی وفات کے بعد ہی علاحدگی کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ مزید یہ کہ "جہیز کے پروانے" اشیائے ضروریہ کا مطالبہ کرتے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی نگاہِ کرم تو اس بات پر ٹکی ہوتی ہے کہ وہ اپنی بے جا ازلی خواہشوں کو لڑکی والوں کے مال وزر سے پورا کریں۔

**جہیز کے نقصانات** ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جہیز کم از کم سات بنیادی نقصانات کی "سوغات" "لیکر" "تشریف" لایا ہے۔

**مذہبی نقصانات** نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

"خیر النکاح ایسر مئونۃ" بہترین شادی وہ ہے جس میں کم سے کم خرچ ہو۔ **(مشکوۃ: باب النکاح)**

مگر رسم جہیز نے اس فرمانِ نبی ﷺ کی عملی تفسیر کو نہایت مشکل بنا دیا ہے۔ مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ جہیز لینا اور فضول خرچی کا مظاہرہ کرنا ایک ایسا فیشن اور ایسا مرض بن گیا ہے کہ "خیر النکاح ایسر مئونۃ" پہ عمل دشوار اور ناممکن سا ہو گیا ہے۔ جہیز سے متعلق دیگر فضولیات نے اور بھی بہت سے امور پر اثر اندازی شروع کر دی ہے۔ جس کے باعث مسلمان بہت سے مذہبی احکام سے

روگرداں نظر آرہے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ مذہبی تصلب کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی ہے اور مسلمان اسلامی تشخص سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے بچیوں کا پتہ لگا کر قبلِ ولادت ہی حمل ضائع کرادیا جاتا ہے جو آیتِ قرآنی کے صریح مخالف اور اشد حرام ہے۔

**معاشرتی نقصانات** جہیز کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی دنیا کا مشکل ترین کام بن گیا ہے۔ ماں باپ لڑکی کی ولادت کے وقت ہی سے چندی چندی اور قطرہ قطرہ جمع کرنا شروع کردیتے ہیں مگر پندرہ سترہ سالوں میں بھی ان کی یہ "سکندری مہم" پوری نہیں ہوپاتی ہے۔ عمومی طور پہ والدین کے سر پہ ایک نہیں بلکہ مختلف لڑکیوں کی ذمہ داری ہوتی ہے جس کے باعث تیاری میں تاخیر ہوتی رہتی ہے اور بچی کی عمر نکلتی رہتی ہے۔ اور بڑھتی عمر کے ساتھ جو فتنہ نشو ونما پاتا ہے وہ ایک صالح معاشرہ کو سیلاب کی طرح بہالے جاتا ہے۔ ہم نظر اٹھا کر اپنے معاشرے کا جائزہ لیں۔ آج ہمارے معاشرے میں شرم وحیا اور ندامت کی چادر اتنی دبیز نہیں رہ گئی ہے جتنی رسمِ جہیز کی آمد اور ٹی وی کی ایجادِ نامحمود سے قبل تھی۔ معاشرے سے صلاح وخیر رختِ سفر باندھ کر اور زاد وتوشہ لے کر صحرا اور بیابانوں کا رخ کرچکے ہیں۔

**اقتصادی نقصانات** رسمِ جہیز اور شادی کی فضول خرچیوں نے شادی خانہ آبادی کو "شادی خانہ بربادی" بنادیا ہے۔ ایک لڑکی کی شادی کے لیے کم از کم دو ڈھائی لاکھ روپے درکار ہوتے ہیں بلکہ خرچ کیے اور زبردستی کروائے جاتے ہیں۔ دو ڈھائی لاکھ روپے بھی اسی وقت کافی ہوتے ہیں جب کہ لڑکے والوں نے "دریا دلی" دکھاتے ہوئے نقد "معاف" کردیا ہو۔ (اتنی مہنگی شادی کو بھی ہمارے معمر اور بزرگ حضرات "مفت کی شادی" کہتے ہیں۔) ماہانہ تین چار ہزار کمانے والا غریب مسلمان کفایت شعاری اور نہایت کنجوسی سے کام لیتے ہوئے ماہانہ ہزار بارہ سو روپے بچاتا ہے۔ جب سترہ اٹھارہ سال بعد اس کے خون پسینے کی گاڑھی کمائی سے بچی ہوئی رقم دو ڈھائی لاکھ تک پہنچتی ہے تو اسے اپنی زندگی کا سارا سرمایہ اور کل پونجی ایک بیٹی کی شادی میں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ایک مڈل کلاس اور اوسط درجے کا مسلمان بیس سال قبل جہاں سے چلا تھا وہ بیس سال بعد بھی وہیں کھڑا نظر آتا ہے۔

دوسری کی شادی کے لیے گھر بار اور شاید تیسری چوتھی کی شادی کے لیے اسے خود کو بیچنا پڑے گا۔ ہم نے ایک نہیں متعدد ایسے مسلم تاجروں کو دیکھا ہے جن کی ماہانہ آمدنی ۱۹۹۷ء میں (جب کہ ہندوستان کے 80 فیصد لوگوں کی آمدنی پانچ چھ ہزار سے بھی کم تھی) پینتیس چالیس ہزار سے زیادہ تھی مگر پے در پے متعدد شادیوں نے ان کی تجارت کی ایسی کمر توڑ دی کہ آج بھی ان کی ہڈیوں سے شکستگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ حشر تو ان لوگوں کا ہوا جو ایک اچھی تجارت اور خاصی معقول آمدنی رکھتے تھے۔ تو مسلسل شادیوں سے ان سے غریب لوگوں کا حشر کیا ہوا ہوگا یہ اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔

**تعلیمی نقصانات** ایک اوسط طبقے کا مسلمان جس کی ماہانہ آمدنی چھ سات یا آٹھ ہزار ہو وہ اپنے چار پانچ بچوں کے لیے تعلیمی اخراجات دو ڈھائی ہزار کیسے افورڈ کرسکتا ہے۔ جب کہ اسے اس مہنگائی کے دور میں گھر کا خرچ بھی چلانا ہے اور متعدد بچیوں کی شادی کے لیے جمع کرنا ایک الگ مسئلہ۔ نتیجۃً ان کے بچے ساتویں آٹھویں تک پہنچتے پہنچتے تعلیم کو الوداع کہہ کر والد کا ہاتھ بٹانے لگ جاتے ہیں۔ اور جو آدھی روٹی کھا کر پڑھانے کا جذبہ دکھاتے بھی ہیں تو بارہویں اور گریجویشن تک پہنچتے پہنچتے ان کے پیٹ کی بھوک جواب دینے لگتی ہے اور جب دوسرے کم تعلیم یافتہ لڑکوں کو اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتے دیکھتے ہیں تو ان کا حوصلہ مزید پست ہوجاتا اور مزید تعلیم کا جذبہ ماند پڑجاتا ہے۔ چناں چہ وہ بھی اپنے بچوں کے تعلیمی سلسلہ کو روکنے پہ مجبور نظر آتے ہیں۔ اس طرح بہ مشکل تین چار فیصد مسلم طلبہ اپنے تعلیم کو اعلیٰ معیار تک پہنچا پاتے ہیں۔ اور جب ہائی ایجوکیشن کی کمی ہے تو اعلیٰ ملازمتوں میں حصہ داری نہ ملنے پر ماتم کناں ہونا اور آنسو بہانا فضول اور عبث ہی نہیں بلکہ حماقت ہے۔ اگر ہم خود اپنی خامیوں کو دور کرلیں تو غیر کی طرف نظرِ سوال اٹھانے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے۔

**معالجاتی نقصانات** ساری پونجی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی میں طوعاً وکرہاً خرچ کرچکے تو اتنی رقم بچتی ہی نہیں ہے جو بوقتِ حاجتِ شدیدہ کام آسکے۔ اور کسی خطرناک مرض کے علاج میں اپنی کمائی سے کسی طرح کی کوئی مدد مل سکے۔ بلکہ بہت سے افراد تو جمع جہیز کی خاطر ہلکے اور معمولی امراض کو سالوں چھپائے اور دبائے رہتے ہیں۔ اور ایک دن اچانک وہ معمولی مرض ناقابلِ علاج بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ یا پھر قابلِ علاج ہوتا بھی ہے تو اتنا گراں اور مہنگا ہوتا ہے کہ وہ برداشت نہیں کرسکتے۔ بالآخر وہ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں اور عزیز واقارب سمیت دیگر مسلمان چند قطرے آنسو اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے سوا کوئی دوسری مدد نہیں کرسکتے ہیں۔



انوار فکر

# حافظِ ملت علیہ الرحمہ اور ان کا نظریۂ تعلیم

مولانا محمد عبد المبین نعمانی

**حافظ** ملت استاذ العلما حضرت علامہ شاہ حافظ عبد العزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان (متوفیٰ: یکم جمادی الآخرہ ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء) ایک دور اندیش مردِ کامل کا نام ہے۔ آپ لکیر کے فقیر نہیں تھے، بلکہ ایک انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ آپ نے وہ سوچا اور وہ کارنامہ انجام دیا کہ جماعت اہلِ سنت کا سر فخر سے اونچا ہوگیا۔ آپ نے دیکھا کہ دنیا کی تمام قومیں علم کے سہارے آگے بڑھ رہی ہیں اور دنیا کے تمام مذاہب آگے بڑھ رہے ہیں، لیکن مسلمان غیر ضروری امور میں تو اپنی دل چسپی بڑھا رہے ہیں، لیکن علم کے میدان میں پیچھے ہوتے جارہے ہیں۔ اگر ان کو علم کے ہتھیار سے لیس نہ کیا گیا تو ان کے عقائد میں تزلزل آجائے گا اور یہ باطل افکار و نظریات کے گھیرے میں آکر اپنی ایمانی دولت کھو بیٹھیں گے۔ یوں ہی عملی بے راہ روی اور اخلاقی پستی جو عام ہوتی جارہی ہے، اس کے ازالے کے لیے بھی علم دین کا سہارا لینا ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"علمی کم زوری ہر برائی کی جڑ اور ہر پستی کی بنیاد ہے۔"

آج دنیا میں وہی قومیں سرخرو نظر آرہی ہیں جو علمی میدان میں پیش رفت کررہی ہیں۔ علم بہر حال بہتر اور مفید ہے، چاہے علم دین ہو یا علم دنیا، لیکن یہ بھی ضروری ہے، کہ صرف علم دنیا آدمی کو دنیادار تو بنا سکتا ہے دین دار نہیں بنا سکتا اور ایک انسان کے لیے دنیا میں رہنے کے لیے علم دنیا جس قدر ضروری ہے اس سے ہزار گنا زیادہ علم دین ضروری ہے کہ بغیر علم دین انسان جانوروں سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمان علم دنیا کے ساتھ علم دین میں بھی آگے بڑھیں۔ دنیاوی علم کے لیے تو کسی فضیلت کی ضرورت نہیں، وہ آدمی خود ہی اپنی ضرورت سمجھ کر حاصل کرتا ہے اور اس کے فوائد خود ہی اس کے ذہن نشین ہیں، لیکن علم دین سے غفلت عام ہے کیوں کہ علم دین کا اصل فائدہ اخروی فلاح ہے جو نگاہوں کے سامنے نہیں اس لیے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ بھی نہیں ہوتی۔ لہٰذا مسلمانوں کو علم دین کی طرف بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی دنیاوی علم بھی بقدر ضرورت ہو تو اس سے دنیاوی فوائد کے ساتھ دین کا بھی فائدہ ہے کہ عالم دین جب علم دنیا سے بھی آراستہ ہوتا ہے تو اس سے وہ دینی کام لیتا ہے، اس طرح اس کا دنیاوی علم بھی دین اور کار ثواب بن جاتا ہے۔ چناں چہ حافظ ملت علیہ الرحمہ سے علم کی اہمیت کے بارے میں پوچھا گیا تو ارشاد فرمایا:

"علم کی اہمیت کا مسئلہ ایسا متفق علیہ ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، جاہل سے جاہل بھی علم کو بڑی اہم اور عظیم دولت سمجھتا ہے۔ دنیاوی علم بھی عزت واقتدار کا ضامن ہے چہ جائے کہ علم دین کہ یہ وہ دولتِ عظمیٰ اور نعمت کبریٰ ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات اور ممتازِ کائنات بناتی ہے، مگر علم پر عامل ہونا شرط ہے۔"

(حافظ ملت نمبر ماہنامہ اشرفیہ، ص: ۸۰)

اس مذکورہ ارشاد میں حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے علم کی اہمیت وافادیت پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور اس قدر جامع بات فرمادی ہے کہ اس سے مختصر اور جامع بیان ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس مختصر ارشاد میں حافظ ملت نے اپنا نظریۂ تعلیم اچھی طرح ظاہر فرمادیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور ارشاد ملاحظہ کرلیں اور دیکھیں کہ حافظ ملت علم اور تعلیم کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں۔ الجامعۃ الاشرفیہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ آپ اسے کیسا دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو فرمایا:

"میں یہ چاہتا ہوں کہ الجامعۃ الاشرفیہ کے فارغین سنی علما ہوں اور وہ ہندی انگریزی اور عربی میں صاحب قلم، صاحب لسان ہوں جو اپنے ہندوستان اور دوسرے ممالک میں مذہب حق اہل سنت وجماعت کی کماحقہ اشاعت وخدمت کرسکیں۔ میں الجامعۃ الاشرفیہ کو اس منزل پر دیکھنا چاہتا ہوں۔" (حافظ ملت نمبر ماہنامہ اشرفیہ، ص: ۸۰)

مختلف اوقات میں مختلف انداز سے حافظ ملت نے اپنے انہیں نظریات کو بار بار دہرایا ہے۔ حافظ ملت علیہ الرحمہ درس میں، تقریر میں اور اپنے اقوال وارشادات میں اختصار وجامعیت کے عادی تھے، کم بولتے مگر نپی تلی بات کہتے۔ زیادہ بولنے اور لمبے چوڑے دعوے کرنے کے

مہتمم دار العلوم قادریہ چریاکوٹ، مئو

عادی نہ تھے اور نہ پسند فرماتے تھے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ اسکیمیں لمبی چوڑی بناتے ہیں اور دعوے خوب کرتے ہیں لیکن کام دیکھیے تو نِل یا نہایت تھوڑا۔ مگر حافظ ملت نے ہمیشہ کم بولنے اور زیادہ کرنے کو اپنا شیوہ بنایا اور اپنی عمر کے آخری لمحات میں (چند سالوں میں) الجامعۃ الاشرفیہ کی شکل میں قوم کو وہ عظیم سرمایہ اور تعلیمی درس گاہ دے گئے کہ پوری جماعت اہل سنت قیامت تک اس پر ناز کرے گی، جس کا فیضان بلاشبہہ آج پوری دنیا میں عام ہوتا جارہا ہے۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے نزدیک وہی تعلیم مفید اور بار آور ہے جس پر عمل بھی کیا جائے، افسوس کہ آج اس پر بہت کم توجہ دی جارہی ہے۔ چناں چہ حافظ ملت علیہ الرحمہ نے علم دین کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا کہ علم پر عمل ہونا شرط ہے۔ جس علم پر عمل نہ ہو وہ اس خزانے کی طرح ہے جس کو دفینہ بناکر رکھا جائے اور اس میں سے کچھ خرچ نہ کیا جائے۔ اس لیے ایک مرتبہ فرمایا:

"لوگ صرف علم سیکھتے ہیں، میں نے حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ سے علم اور عمل دونوں سیکھا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ جس طرح حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ اپنے معاصرین میں ممتاز مقام کے مالک تھے، اسی طرح حافظ ملت بھی اپنے فیضانِ علمی کو عام کرنے میں فائق الاقران تھے، کیوں کہ علم کا پہاڑ بننا تو آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ جو کچھ پڑھتے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے، اس سلسلے میں وہ احادیث آپ کے سامنے تھیں جن میں علم والوں کی بدعملی کی مذمت کی گئی ہے اور علم کے ساتھ عمل کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی چند حدیثیں رقم کی جارہی ہیں کہ یہ مضمون احادیث کی روشنی میں بروقت قارئین کے ذہن نشین ہو جائے۔

"عن الحسن قال: العلم علمان فعلم فی القلب فذٰلک العلم النافع وعلم فی اللسان فذٰلک حجة اللّٰہ عز وجل علی ابن آدم."

(رواہ الدارمی فی سننہ، ج:۱، ص:۸۶، حدیث اکادمی، فیصل آباد)

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: علم دو ہیں، ایک تو وہ علم جو دل میں ہے، یہ علم نافع ہے۔ دوسرا وہ علم جو محض زبان پر ہوتا ہے۔ یہ اللہ عز وجل کی طرف سے آدمی پر حجت ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ قیامت میں پوچھے گا کہ میں نے تمھیں علم دیا تو تو نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟)

"عن ابی هریرة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ مثل علم لا ینتفع کمثل کنز لا ینفق منہ فی سبیل اللّٰہ."

(رواہ الدارمی فی سننہ، ج:۱، ص:۱۱۳، باب البلاغ عن رسول اللّٰہ ﷺ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس علم کی مثال جس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے (یعنی اس پر عمل نہ کیا جائے) اس خزانے کی سی ہے جس سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے۔

یعنی علم ومال دونوں اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرکے اس کی خوشنودی حاصل کی جائے اور علم پر عمل کرکے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے اور جس نے ان دونوں نعمتوں کا حق ادا نہیں کیا، ان کی ناقدری کی تو اس پر اللہ مواخذہ فرمائے گا۔

ایک اور حدیث ملاحظہ کریں جس سے علم دین کے بارے میں اسلامی نظریے کی خوب وضاحت ہوتی ہے:

"عن ابی هریرة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال، قال رسول اللّٰہ ﷺ من تعلم علما یبتغی بہ وجہ اللّٰہ لا یتعلمہ الا لیصیب بہ عرضا من الدنیا لم یجد عرف الجنة یوم القیمة- یعنی ریحها." (مشکاۃ المصابیح کتاب العلم حدیث ۲۱۳، ص:۳۵، مجلس برکات، اشرفیہ مبارک پور)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے وہ علم سیکھا جس سے اللہ کی رضا حاصل کی جاتی ہے (یعنی علم دین) مگر وہ اسے رضائے الٰہی کے بجائے محض دنیا کا مال یا عزت حاصل کرنے کے لیے سیکھ رہا ہے تو ایسا شخص قیامت کے دن جنت کی خوشبو دار ہوا بھی نہ پائے گا۔

یہ چند حدیثیں اس لیے نقل کر دیں کہ علم سے کیا مقصود ہونا چاہیے۔ طالب علم کو کیسا ہونا چاہیے؟ اور تعلیم کی غرض وغایت کیا ہونی چاہیے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل واضح ہو جائے۔ اس سلسلے کی اور حدیثیں ہیں، لیکن اختصار کے پیشِ نظر انھیں پر اکتفا کیا گیا۔

اب جس طالب علم یا معلم وعالم کی نگاہ میں یہ حدیثیں ہوں گی اور دل میں گھر کر جائیں گی تو یقیناً وہ اپنا کاروانِ علم اسی رخ پر لے جائے گا جس کی طرف یہ حدیثیں اشارہ کر رہی ہیں۔ لہٰذا حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے پیش نظر بھی یہ حدیثیں تھیں اور انھیں کو بنیاد بنا کر آپ نے اپنا نظریۂ تعلیم متعین کیا اور پھر اس پر پوری زندگی چلتے رہے، تلامذہ کو چلاتے رہے اور قوم کو اسی کا درس دیتے رہے۔

اب ہم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے خاص خدمتِ دین کے لیے علم حاصل کیا





تھا، دنیا کمانے یا ملازمت کے لیے نہیں، چناں چہ ایک سوال کے جواب میں خود فرماتے ہیں۔

"میں نے ملازمت کے لیے علم دین حاصل ہی نہیں کیا تھا، نہ مجھے ملازمت کی حاجت تھی۔ عربی تعلیم سے پہلے میں امامت ومدرسی کے فرائض انجام دینے کے علاوہ اپنے گھر کا کام پڑوسیوں سے زیادہ کرلیا کرتا تھا جو میری اور میرے متعلقین کی ضرورت کا کفیل تھا تو مجھے ملازمت کی کیا ضرورت تھی۔ البتہ یہ پختہ ارادہ کیا کہ سلسلۂ تدریس ضرور جاری رکھوں گا، خالصاً لوجہ اللہ (خالص اللہ کی رضا کے لیے) پڑھاؤں گا، خانگی ضرورت کے لیے گھر کا کام یا تجارت کافی ہوگی۔ اس لیے آگرہ کی جامع مسجد کی خطابت وامامت قبول نہیں کی، حالاں کہ تنخواہ ۱۰۰ ؍روپے ماہانہ تھی (جو اس وقت بہت بڑی تنخواہ تھی) اور حضرت صدر الافاضل علیہ الرحمہ نے انتہائی اصرار بھی فرمایا تھا۔"

(انٹرویو حافظ ملت، حافظ ملت نمبر، ص:۷۲)

اس اقتباس سے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے اخلاص فی الدین اور نظریۂ تعلیم پر بھرپور روشنی پڑتی ہے، مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے جب استاذ گرامی حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے مبارک پور جانے اور تدریس کے فریضے کی انجام دہی کی بات کی تو آپ نے عرض کیا۔۔۔ "میں ملازمت کا ارادہ نہیں رکھتا۔" اس پر حضرت صدر الشریعہ نے فرمایا: "میں ملازمت کے لیے کب کہہ رہا ہوں، میں تو دین کی خدمت کے لیے مبارک پور بھیج رہا ہوں۔" اور یہ بھی فرمایا کہ یہ مت دیکھیے گا کہ کیا مل رہا ہے۔ اس لیے آپ نے یہ فرمایا: میں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ کیا مل رہا ہے، جو ملا اسے غنیمت سمجھا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ وہ کلمات ہیں جنھیں حافظ ملت علیہ الرحمہ نے متعدد بار ارشاد فرمایا اور ان کانوں نے سنا۔ آج بھی اگر اسی نظریۂ للّٰہیت و خدمت دین پر اساتذہ وعلما قائم ہو جائیں تو دین کا بہت بڑا کام ہو سکتا ہے۔ لیکن افسوس! دنیا کمانے کا جذبہ عام ہے اور اسی کو سب پر فوقیت حاصل ہے اور نئی نسل بھی تیزی سے اسی روش پر چل رہی ہے۔

حضور حافظ ملت کے اندر خدمت دین کا یہی جذبہ تھا کہ شروع میں روزانہ تیرہ تیرہ کتابیں پڑھایا کرتے اور رات کو مناظرانہ تقریر کے لیے بھی وقت نکالتے۔

ایک بار فرمایا: "میں نے کبھی اپنے کو مدرسہ کا ملازم تصور نہیں کیا، ہمیشہ خادم ہی سمجھا۔" چناں چہ تلامذہ کو بھی ہمیشہ اسی کی تلقین کرتے کہ دین کی خدمت سمجھ کر کام کرنا چاہیے، اپنے کو ملازم سمجھ کر نہیں۔

درسی کتابوں کی تعلیم سے متعلق حافظ ملت کا نظریہ تھا کہ ابتدائی کتابوں پر زور دیا جائے کہ اس سے آگے بڑھنے اور اونچی کتابیں سمجھنے کی راہ ہموار ہوتی ہے اور ضروری قواعد بھی ابتدائی کتابوں میں ہی ہوا کریں جنھیں ازبر کرنا ضروری ہوتا ہے، اسی سے علمی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو طلبہ ابتدائی کتابوں میں محنت نہیں کرتے وہ آخر تک کم زور ہی رہتے ہیں، لہٰذا طلبۂ مدارس اسلامیہ کو چاہیے کہ حضور حافظ ملت کی اس تلقین پر بھرپور توجہ دیں کہ یہی ترقی کا زینہ ہے۔

علم وعمل کے تعلق سے مولانا عبد اللہ خان صاحب، حافظ ملت کا قول نقل کرتے ہیں، اسے بھی سن لیا جائے اور حرزِ جاں بنایا جائے۔

"خواہ کتنا ہی علم حاصل کر لیا جائے لیکن اس کا اثر اگر انسان کی زندگی پر نمایاں نہ ہو تو ایسا علم سودمند نہیں ہوتا۔ اس لیے جو کچھ پڑھا جائے اور جتنا بھی پڑھا جائے، اس پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔" (حافظ ملت افکار اور کارنامے، ص:۳۸)

حافظ ملت علیہ الرحمہ نے تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی زور دیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"بلاشبہہ ایسی تعلیم جس میں تربیت نہ ہو، آزادی وخود سری کی فضا ہو، بے سود ہی نہیں نتیجے کے اعتبار سے مضر ہے۔"

علم وعمل کے تعلق سے آپ کا یہ واقعہ بھی بڑا عبرت آموز ہے۔

حافظ ملت فرماتے ہیں:

"ایک روز ایسا بھی آیا کہ ایک باسی روٹی رکھی تھی، بعد مغرب لے کر کھانے بیٹھا۔ فقیر نے دروازے پر آواز دی، (کھانے کا سوال کیا) ہم نے آدھی روٹی اسے دے دی، آدھی خود کھائی، کیوں کہ ہم نے پڑھا تھا۔

نیم نانِ گر خورد مردِ خدا ... بذلِ درویشاں کند نیم دگر

(گلستاں)

لہٰذا ہم نے خیال کیا کہ اگر اس پر ہم عمل نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔" (روایت حکیم عبد الغفور صاحب علیہ الرحمہ برادر خرد حافظ ملت)

اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضور حافظ ملت صرف نظریے کے آدمی نہ تھے، عمل کے پیکر تھے، کہ جو پڑھا اس پر عمل کرکے بھی دکھایا۔ ضرورت ہے کہ آج ہم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے ارشادات سے فائدہ اٹھائیں، خاص طور سے مدارس اسلامیہ کے ذمہ داروں کو چاہیے کہ حافظ ملت کے ارشادات کی روشنی میں اپنے اپنے مدارس اور ان کے نظام عمل کا جائزہ لیں۔ ☆☆☆

# حافظ ملت بحیثیت ماہر تعلیم

مولانا محمد ساجد رضا مصباحی

**تعلیم** و تعلم اور درس و تدریس ایک مبارک عمل ہے۔ اس با برکت عمل میں اپنا قیمتی وقت صرف کرنے والوں کے لیے قرآن و حدیث میں بڑی دل نواز بشارتیں آئی ہیں۔ لیکن اس دشت کی سیاحی کی مشکلات بھی مسلم ہیں، کامیاب معلم وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے دل میں حد درجہ اخلاص، اپنے فرائض سے آشنائی، طلبہ کے روشن مستقبل کی فکر، شخصیت سازی کا ہنر اور ادارے کی خیر خواہی کا جذبہ پوری طرح موج زن ہو۔ حضور حافظ ملت ان اساتذۂ ماہرین میں سے ایک تھے جنھوں نے ایک کامیاب معلم کی حیثیت سے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ طالبانِ علومِ اسلامیہ کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت کو سنوارنے و نکھارنے میں گزارا۔ آپ نے اپنے گلستانِ علم و حکمت کے خوشہ چینوں کو علم و حکمت اور فکر و دانش کا دُرِّ شہوار بنا کر میدانِ عمل میں اتارا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور حافظ ملت کی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھنے والے طلبہ نے زندگی کے جس میدان میں بھی قدم رکھا کامیابیوں نے ان کے قدم چومے، فتح و ظفر نے بڑھ کر خود ان کا استقبال کیا، روے زمین کے جس خطے میں بھی گئے، اسے علم و ہنر کی روح پرور خوشبوؤں سے معطر کر ڈالا۔ آج فرزندانِ اشرفیہ برصغیر سمیت دنیا کے مختلف ممالک میں امتِ مسلمہ کو علم و عمل کے نور سے مستفید کر رہے ہیں۔ گلستانِ اشرفیہ کی یہ ساری بہاریں حضور حافظ ملت کے اخلاص، جد و جہد، فکر و تدبر اور طریقۂ تعلیم و تربیت کا اثر ہیں۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان تمام مروجہ علوم و فنون پر کامل دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ طلبہ کی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ آپ کے اندر جوہر شناسی کا کمال بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ آپ کی نگاہیں مٹی میں ملے ہوئے ناتراشیدہ پتھروں کے پوشیدہ جوہر کو پہچان لیتی تھیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے آپ اپنے معاصرین میں امتیازی شناخت رکھتے تھے اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

حضور حافظ ملت تقریباً ۴۴ر سالوں تک گلشن اشرفیہ کی آبیاری کرتے رہے، ۳۷ر سال تک جامعہ اشرفیہ کی صدارت کی ذمہ داریاں نبھائیں، ۷ر سال سربراہِ اعلیٰ کے باوقار عہدے پر فائز رہے۔ اس طویل عرصے میں آپ نے الجامعۃ الاشرفیہ کی تعمیر و تزئین کے ساتھ ساتھ طلبۂ اشرفیہ کے اندر تعلیم و تربیت کا ایسا خوش گوار ماحول پیدا کیا جس کی مثال برصغیر کے مدارس اسلامیہ کی تاریخ میں دور دور تک نہیں ملتی۔ آپ نے اپنے کردار و عمل کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے ایسے اصول مرتب کیے جن پر عمل پیرا ہو کر کاروانِ اشرفیہ شاہراہِ علم و فن پر رہتی دنیا تک اپنی تابانیاں بکھیرتا رہے گا۔

کسی بھی ادارے میں اطمینان بخش تعلیم کے لیے داخلی معاملات میں شفافیت، طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کے درمیان باہمی اخلاص و محبت اور خوش گوار ماحول کا ہونا نہایت ضروری ہوا کرتا ہے۔ آج ہماری نظروں کے سامنے کتنے ہی ایسے مدارس ہیں جہاں باصلاحیت اساتذہ کی ایک بڑی ٹیم موجود ہے، ذمہ دارانِ ادارہ نے انتظام و انصرام کے ساتھ طلبہ کی بھیڑ بھی اکٹھا کر رکھی ہے، شعبۂ مالیات پر خصوصی توجہ کی وجہ سے عالی شان عمارتیں بھی کھڑی کر لی گئی ہیں، لیکن جب وہاں کے تعلیمی نظم و نسق اور طلبہ کی استعداد کا پتہ لگایا جاتا ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ان اداروں کے ذمے داران اپنے طلبہ اور اساتذہ میں فکر و عمل کا وہ پر خلوص جذبہ پیدا نہ کر سکے جو تعلیمی میدان میں از حد ضروری ہوا کرتا ہے۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان نے اشرفیہ کے داخلی معاملات کو خوش گوار بنانے کے لیے طلبہ و اساتذہ کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کر کے اپنی فکر و تدبر اور خداداد صلاحیتوں سے جامعہ اشرفیہ میں نہایت پر سکون علمی فضا قائم کر دی تھی، جہاں طلبہ و اساتذہ ایک مشترکہ خاندان کی طرح رہ کر اپنی پوری توجہ تعلیم و تعلم پر صَرف کیا کرتے تھے۔

طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کسی بھی تعلیمی ادارے کے بنیادی عناصر ہوا کرتے ہیں، ان ہی تینوں عناصر کے پیہم جد و جہد، اخلاص و دیانت اور فکر و عمل کے توازن سے ادارہ ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ ان تینوں کے اندر عمل کا جذبہ، ادارے کے ساتھ ہمدردی اور اپنے منصبی فرائض سے حد درجہ لگاؤ ہونا چاہیے۔ حضور حافظ ملت نے اپنے اعلیٰ فکر و تدبر اور بے پناہ کوششوں سے طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کے دلوں میں ادارے کی محبت اور حرکت و عمل کا ایسا جنون پیدا کر دیا تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیتے اور ادارے کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر طرح کی قربانیاں پیش کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہتے۔ ذیل کے سطور میں ہمیں دیکھنا ہے کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان نے ایک قائد کی حیثیت سے ان تینوں اجزاے ترکیبی کے درمیان توازن کس طرح برقرار رکھا اور ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ کس نوعیت کا تھا۔

## حافظ ملت اور طالبانِ علومِ اسلامیہ

**ایک کامیاب معلم کی پہچان** یہ ہے کہ وہ تلامذہ کو اپنی اولاد سمجھ کر ان کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دے۔ ملازمت براے ملازمت کا تصور دور دور تک بھی اس کے ذہن و دماغ میں نہ ہو، طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ان کے اخلاق و کردار کی بھی نگرانی کرے، جب کہ آج استاذ اور شاگرد کا رشتہ عموماً حلقۂ درس تک محدود ہوا کرتا ہے۔ حضور حافظ ملت اپنے تلامذہ پر باپ سے بھی زیادہ شفیق تھے۔ اپنے حلقۂ درس میں شامل ہونے والے طلبہ کی سخت نگرانی فرماتے، ان کے اخلاق و کردار پر بھی کڑی نگاہ رکھتے، لیکن ان کی عزتِ نفس کا ہمیشہ خیال رکھا کرتے، جب بھی کسی طالب علم کو بلاتے تو اس کے درجہ کا لحاظ کرتے ہوئے مولوی صاحب، قاری صاحب یا حافظ صاحب کہہ کر بلاتے، کبھی بھی انھیں ایسا غیر مناسب جملہ نہیں کہتے جس سے انھیں کمتری کا احساس ہو، گویا آپ ”درشتی و نرمی بہم در بہ است“ کے سچے پیکر تھے۔ آپ تنگ دست طلبہ کی مالی اعانت بھی فرماتے۔ مولانا قاری محمد حسین اعظمی اپنی طالب علمی کے زمانے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں:

”جب میں اشرفیہ میں زیر تعلیم تھا، ایک وقت والد صاحب نے خانگی پریشانیوں کی وجہ سے مجھے تعلیم چھوڑنے کے لیے کہا، لیکن حافظ ملت کو معلوم ہوا تو انھوں نے تکمیل کا حکم دیا اور میری کفالت خود اپنے ذمہ کر لی، بعد میں والد صاحب نے میری شادی کر دی کہ شاید اسی وجہ سے ترکِ تعلیم پر مجبور ہو مگر حافظ ملت نے میرے ساتھ میری اہلیہ کے اخراجات کا ذمہ بھی لے لیا اور کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ میری فراغت ہو گئی۔“ (انوارِ حافظ ملت، ص: ۱۴)

عام طور پر اساتذہ کی شفقت و محبت کا سلسلہ طالب علم کی فراغت کے بعد منقطع ہو جاتا ہے، لیکن حضور حافظ ملت ایک شفیق باپ کی طرح فراغت کے بعد بھی تلامذہ کی خبر گیری فرماتے اور میدانِ عمل کے نشیب و فراز اور دشواریوں میں صبر و استقلال کی نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا یہ طرزِ عمل صرف اپنے ذہین تلامذہ ہی کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ کند ذہن طلبہ کو بھی اسی طرح عزیز رکھتے تھے جس طرح ذہین اور لائق و فائق شاگردوں کو رکھا جاتا ہے۔

حضور حافظ ملت اپنے شاگردوں کو علم و حکمت کے اوجِ ثریا پر دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے ان کی تعلیم و تربیت میں کسی طرح کی کوتاہی قطعاً برداشت نہیں کرتے۔ انھیں اپنے حلقۂ درس میں متعلقہ کتابوں کے مطالعے پر ابھارتے، مطالعہ کی اہمیت و افادیت سمجھاتے۔ اکثر فرمایا کرتے:

”مطالعہ ضرور کرو، اگرچہ مصنف کی مراد کے برعکس مطالعہ میں سمجھو، مگر دیکھو ضرور، کچھ ایام اس طرح مطالعہ میں گزرتے گزرتے وہ دن بھی آئے گا کہ کچھ صحیح بھی دیکھنے لگو گے۔ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے اس منزل پر پہنچ جائے گا کہ مطالعہ میں عبارت کی مراد تم از خود نکال سکو گے۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد اب درس گاہ میں صرف اس لیے جانا ہو گا کہ استاذ کی تقریر و ترجمہ اور بیانِ مطلب سے اپنے مطالعہ کی صحت کی توثیق ہو جائے۔“

حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان طلبہ کو اکثر حفظِ اوقات کی تلقین فرمایا کرتے اور ضیاعِ وقت کو سب سے بڑی مصیبت قرار دیتے تھے۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ جمعہ اور جمعرات کی چھٹیاں ہفتہ بھر میں پڑھے ہوئے اسباق کو دیکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ہر سبق اس طرح پڑھنا چاہیے کہ اسی سبق کا امتحان دینا ہے۔ حضور حافظ ملت کی ان نصیحتوں کا طلبہ پر بڑا گہرا اثر ہوتا اور طلبہ کے اندر بیداری کی لہر دوڑ جاتی اور وہ تمام غیر تعلیمی مصروفیات کو چھوڑ کر نہایت یکسوئی کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول میں مصروف ہو جاتے۔

حضور حافظ ملت کی درس گاہِ علم و ادب سے کوئی طالب علم کبھی تشنہ کام نہیں لوٹتا، آپ نے کبھی کسی طالب علم کے سوال کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی طلبہ کے اعتراضات پر کبھی برہم ہوئے، بلکہ جب کوئی طالب علم سوال کرتا تو آپ کے چہرے پر بے پایاں مسرت کے آثار نمایاں ہو جاتے اور اس طالب علم کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔

کبھی کبھی فرمایا کرتے "سوالات بیدار ذہن کی علامت ہیں"۔

حضور حافظ ملت طلبہ کی حاضری کا خاص خیال رکھتے تھے اور درس گاہوں سے طلبہ کی غیر حاضری کو تعلیم کے لیے سم قاتل سمجھا کرتے تھے۔ اس ضمن میں صدر العلما علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ کے ساتھ پیش آنے والا ذیل کا واقعہ دورِ حاضر کے طلبہ و اساتذہ دونوں کے لیے کئی جہتوں سے درسِ عبرت ہے۔ حضرت صدر العلما فرماتے ہیں:

"طلبہ خصوصاً پڑھنے والے طلبہ کی حاضری پر بھی نظر رکھتے..... ایک بار جمعرات کے بجائے جمعہ کی صبح کو گھر جا رہا تھا، جوں ہی گیٹ کے قریب ہوا، حافظ ملت سے ملاقات ہو گئی، فرمایا! آج جا رہے ہو؟ تو پھر کل؟ میں نے عرض کیا، رات کو مشقی بزم میں شرکت کے پیشِ نظر کل نہ جا سکا......... دوسرے دن سنیچر کو میں گھر سے بہت سویرے چلا، سواری تو کبھی دن میں ملتی، کبھی نہ ملتی، اتنی صبح سویرے ملنے کا تصور بھی نہ تھا، اس لیے ابراہیم پور چھوڑ کر ایک دوسرے شارٹ راستے سے چلا، پہلی گھنٹی حضرت ہی کے یہاں تھی۔ عبارت خوانی کے دوران پہنچ گیا، سبق کے بعد حضرت نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے موجود پایا اور بہت خوش ہوئے۔ یوں بھی ناغہ کی عادت نہ تھی۔ مبارک پور کے پورے تین سالہ ایامِ تعلیم میں کل غیر حاضری بیس دن سے زیادہ نہ ہو گی، جس میں دو تین دن کسی ضرورت کے تحت باقی سخت علالت کے تحت۔" (انوارِ حافظ ملت، ص: ۳۸-۳۹)

حضور حافظ ملت طلبہ میں عملی اسپرٹ پیدا کرنے کے لیے موقع بموقع نہایت موثر اور دل پذیر خطاب فرمایا کرتے، جس میں طلبہ کو ان کے مقصدِ حیات، عالمانہ وقار، علم کی اہمیت، نہایت خوب صورت پیرائے میں سمجھاتے۔ مثالوں کے ذریعہ انھیں فکر و عمل اور محنت و مشقت پر ابھارتے۔ اکثر فرمایا کرتے: "محض کسی دار العلوم کے اندر رہنے سے علم نہیں آسکتا۔ علم کے حصول کے لیے محنت اور عرق ریزی ضروری ہے۔ اگر صرف مدرسے میں رہنے سے علم حاصل ہو جاتا تو جامعہ کے ملازمین جو برسوں سے یہاں رہ رہے ہیں بڑے جید عالم ہوتے۔"

ان خطابات کا اثر یہ ہوتا کہ طلبہ کے اندر جد و جہد کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی، کھیل کود میں اپنا وقت ضائع کرنے والے طلبہ کے شوق کو بھی مہمیز لگتی اور وہ بھی محنت و مشقت میں لگ جاتے۔

حضور حافظ ملت کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ ہمارے طلبہ علمی و فکری پختگی کے ساتھ عملی میدان میں بھی قوم کے لیے قابلِ تقلید اور نمونۂ عمل بنیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے: "عالم کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اگر اس کے اندر عمل نہیں تو نہ وہ عند اللہ مقبول ہو سکتا ہے اور نہ عند الناس۔

حضور حافظ ملت اگر اپنے طلبہ کو شریعتِ مطہرہ کی حدود سے سرِ مو بھی متجاوز دیکھتے تو نہایت حکیمانہ انداز میں اس کی اصلاح فرماتے۔ نمازوں کے خود بھی پابند تھے اور اپنے تلامذہ کو بھی اس کی پابندی کا سختی کے ساتھ حکم دیتے، بگڑے ہوئے طلبہ کی اصلاح کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے۔ بڑے سے بڑے قصور پر مدرسے سے طلبہ کا اخراج حضرت کی طبیعت پر بڑا شاق گزرتا تھا۔ فرماتے تھے: مدرسے سے طلبہ کا اخراج ایسے ہی ہے جیسے کوئی باپ اپنے کسی بیٹے کو عاق کر دے یا جسم کے کسی بیمار عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ ایک موقع پر فرمایا:

"انتظامی مصالح کے پیشِ نظر اگرچہ یہ (طلبہ کا اخراج) شرعاً مباح ہے لیکن میں اسے بھی ابغض مباحات سمجھتا ہوں۔"

(حیات حافظ ملت، ص: ۱۸۱)

طلبہ کے ساتھ حضور حافظ ملت کے مخلصانہ و مشفقانہ برتاؤ ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ کا ہر شاگرد آپ کو ٹوٹ کر چاہتا اور آپ کے اشارۂ ابرو پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہتا اور علم و عمل کے زیور سے ایسا آراستہ ہوتا کہ زندگی کے کسی بھی میدان میں کبھی ناکامی کا احساس نہیں ہوتا۔

ع: خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

## حافظ ملت اور اساتذۂ اشرفیہ

کسی بھی تعلیمی ادارے کے صدر مدرس کی حیثیت ایک کنبہ کے سربراہ کی سی ہوتی ہے، جو اپنے کنبے کی فلاح و بہبود کے لیے ہر طرح سے جتن کرتا ہے، کنبے کے تمام افراد کی کارگزاریوں پر نظر رکھتا ہے، کوتاہی برتنے والوں کو تنبیہ کرتا ہے اور اچھی کارگزاریوں پر شاباشی دیتا ہے۔ حضور حافظ ملت الجامعۃ الاشرفیہ کے اساتذہ اور طلبہ کو اپنے کنبہ ہی کی طرح سمجھتے تھے۔ مولانا بدر القادری مصباحی لکھتے ہیں:

"اشرفیہ کا پورا اسٹاف اور طلبہ آپ کے کنبے کی حیثیت رکھتے تھے۔ طلبہ کو آپ اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ماتحت مدرسین کے کاموں کی نگرانی اور جائزہ، طلبہ کی تعلیمی ذمہ داریوں کی تکمیل، ادارے کے پورے ماحول کو خالص علمی بنائے رکھنے کا اہتمام،





مدرسین اور طلبہ کی خامیوں پر نوٹس لینا اور ان کا انسداد کرنا حضرت حافظ ملت کا کمال تھا۔ آپ سے نہ کوئی ماتحت ناخوش تھا اور نہ آپ نے انتظامیہ اور طلبہ کو ان کے معیار سے ہٹ کر ادارے کے علمی توازن کو کبھی بگاڑنے کا موقع دیا۔ وہ ایسے مرکزِ ثقل تھے جس پر پورے ادارے کا انحصار تھا۔" (حیات حافظ ملت، ص: ۳۲۸)

حضور حافظ ملت تمام مدرسین کی ضرورتوں کا خیال رکھتے، بغیر مطالبہ کے انتظامیہ کے توسط سے ان کی ضرورتیں پوری کراتے، آپ مدرسین کی ضرورتوں اور پریشانیوں سے بخوبی واقف تھے، کیوں کہ آپ نے خود اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اس دشت کی سیاحی میں گزارا تھا۔ آپ کسی بھی مدرس کو ملازم تصور نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں دین کا خادم سمجھتے تھے۔ ایک بار آپ کی مجلس میں لوگوں نے مہنگائی کا تذکرہ کیا۔ آپ لوگوں کی باتیں بڑی متانت کے ساتھ سنتے رہے، اخیر میں فرمایا کہ جب گرانی کا یہ حال ہے تو مدرسین کی تنخواہوں میں اضافہ ضروری ہے، پھر دوسرے دن میٹنگ بلائی اور بلا درخواست کے تمام مدرسین کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا۔

آج کل عام طور مدارس کا حال یہ ہے کہ دیگر مصارف میں تو خوب دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے، لیکن اساتذہ کی تنخواہیں کم سے کم مقرر کی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ معاشی طور پر پریشاں حال رہتے ہیں اور یکسوئی کے ساتھ طلبہ کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دے پاتے۔ اس کے ساتھ یہ وبا بھی عام ہے کہ اساتذہ کی تقرری کے وقت انھیں معمولی تنخواہ پر یہ کہہ کر بلا لیا جاتا ہے کہ ابھی آپ اتنی تنخواہ پر تشریف لائیں، آپ کی کارگزاری دیکھنے کے بعد مشاہرے میں اضافہ کر دیا جائے گا، پھر سال بھر تک کسی طرح ٹال مٹول کیا جاتا ہے اور سال کے اخیر میں نوٹس دے کر مدرس کو مدرسے سے علاحدہ کر دیا جاتا ہے، آئندہ سال پھر کوئی نیا شکار تلاشا جاتا ہے اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایسے اداروں کو ہمارے بعض احباب "ٹریننگ سینٹر" بھی کہا کرتے ہیں جو بالکل بجا ہے۔

حضور حافظ ملت کبھی خود سے کسی مدرس کو بلا وجہ علاحدہ نہیں کرتے تھے۔ ماہِ رمضان ۱۳۹۵ھ کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں نے خارجاً سنا تھا کہ مفتی عبد المنان صاحب سے بمشاہرہ پانچ سو روپیہ انوار القرآن کے لیے بات ہوئی ہے، اگر ایسا ہے یا ہو سکے تو مجھے انکار نہیں، لیکن میرے سر یہ نہ رکھا جائے کہ حافظ صاحب کی اجازت ہو، میری اجازت کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ میں ان کو علاحدہ کر رہا ہوں، وہ خود تشریف لے جائیں یا کوئی دوسرا مدرس تو میں انوار القرآن کی محبت میں اس غم کو برداشت کر سکتا ہوں، میں نے جتنے مدرس رکھے ہیں کسی کو علاحدہ نہیں کرنا چاہتا، اشرفیہ کے لیے سب ضروری ہیں۔" (حیات حافظ ملت، ص: ۳۳۱)

اپنے ماتحت مدرسین کے ساتھ آپ کا یہ طرزِ عمل مدارس اسلامیہ کے ان ذمہ داران کے لیے درسِ عبرت ہے جو اپنے ماتحت مدرسین اور علمائے کرام کو بلا وجہ تنگ کرتے ہیں اور وسعت ہونے کے باوجود ان کی تنخواہیں کئی کئی مہینے تک روک کر ان کے گھروں میں فاقے کی کیفیت پیدا کر ڈالتے ہیں، اس کے باوجود ان سے حسن کارکردگی اور بہتر تعلیم کی امید رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نصیب کرے۔

## حضور حافظ ملت اور انتظامیہ

حضور حافظ ملت مبارک پور اور اہلِ مبارک پور سے بڑی محبت فرماتے تھے، اہلِ مبارک پور بھی حضور حافظ ملت اور الجامعۃ الاشرفیہ کے لیے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے تیار رہتے، حضور حافظ ملت اپنے اخلاص و محبت اور علم و عمل سے اہلِ مبارک پور کے دلوں میں الجامعۃ الاشرفیہ کی تعمیر و ترقی کا جذبۂ بے کراں پیدا کر دیا تھا، مبارک پور کے بوڑھے، بچے، جوان بھی کو تحریکِ اشرفیہ سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ حافظ ملت کی حسن تربیت سے انتظامیہ کے دلوں میں نام و نمود کے بجائے علم و حکمت کی اشاعت کا جذبہ موج زن تھا۔ وہ علما و طلبہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے، ان کے آرام و آسائش کے لیے ہمیشہ تگ و دو کیا کرتے۔ حضور حافظ ملت بھی طلبہ و اساتذہ سے انتظامیہ کی جاں فشانیوں کا تذکرہ کرتے اور انتظامیہ کے قوانین کے نفاذ کی راہیں ہموار کرتے۔ کسی حال میں بھی مجلس منتظمہ، مدرسین اور طلبہ میں ناخوش گوار ماحول پیدا ہونے نہیں دیتے۔ انتظامیہ کے افراد بھی مدرسے کے خالص تعلیمی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے اور نہ ہی کسی طالب علم کے لیے بے جا سفارشات لے کر حاضر ہوتے، بلکہ ہر شعبے کے ذمہ داران اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے کوشاں رہتے۔ حضور حافظ ملت نے اپنی حسن تدبیر سے طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کے درمیان جس طرح توازن برقرار رکھا وہ اپنے آپ میں نہایت حیرت انگیز ہے۔

آج بھی الجامعۃ الاشرفیہ کا علمی کارواں حضور حافظ ملت کے کھینچے ہوئے انہی خطوط پر چل کر نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کا سفر طے کر رہا ہے۔ ☆

# ہندوستان اور ہندوستانی پولیس

صابر رضا رہبر مصباحی

کسی بھی ملک کی اصل طاقت اور اس کی روح وہاں کی پولس اور اس کا حفظاتی دستہ ہوتا ہے۔ نظم ونسق اور تعمیر وترقی کا سارا انحصار اسی کے اردگرد گردش کرتا ہے، کسی بھی حکمراں اور ملک کے لیے اس کا تحفظاتی شعبہ بڑی ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیوں کہ ایک طرف جہاں وہ سماج کی پر امن فضا کو مکدر اور بدامنی سے پاک کرنے میں خصوصی رول نبھاتا ہے وہیں وہ عوام اور حکومت کے مابین ایک مضبوط رشتہ بھی استوار کرتا ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ کسی بھی ملک کی پولس کے کردار کو دیکھ کر ہی وہاں کی حکومت کے رخ کو متعین کیا جاتا ہے، یعنی پولس کا کردار جتنا شفاف ہوگا حکومت بھی اسی قدر جمہوریت کی حامل ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ اس شعبہ میں پیدا ہونے والی ذرا سی بدنظمی ملک کے تحفظ وسلامتی کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی ملک پر شامت آئی ہے اور اسے بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تو اس کے پس پردہ وہاں کے تحفظاتی وسلامتی شعبے کی بدامنی وبدعہدی کارفرما رہی ہے۔ دراصل پولس عوام وملک کا محافظ ہوتی ہے، اس کے وجود کو عمل میں لانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عوام کی جان ومال اور ملک کی حفاظت ونگہداشت کریں۔

تعصب وجانب داری کا ادنی تصور بھی اس کی جان لینے کے مترادف ہے، اس لیے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کسی بھی عام شخص کو اس عہدہ پر براجمان کرتے وقت اس سے باضابطہ حلفیہ عہد وپیمان لیا جاتا ہے۔ اب ہمیں بتانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ جس ملک کی پولس کی سرشت میں تعصب وعناد کا عنصر شامل ہو جائے، محافظ ہی قاتل کا روپ دھار لے، جرائم کا خاتمہ کرنے والا ہی اس کو فروغ دینے لگے تو اس ملک کا مستقبل کتنا درخشاں اور اس کے شہری کتنے محفوظ ہوں گے!!

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جو مختلف مذاہب کا گہوارہ اور نوع بہ نوع تہذیبوں کا سنگم ہے مگر یہاں کی پولس اور دیگر شعبوں میں جرائم اور تعصب وعناد کے بڑھتے پیراگراف نے اس کے وجود پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ ملک میں چار جانب لوٹ مار، عصمت دری، ظلم وتشدد اور رشوت خوری کا بازار شباب پر ہے مگر اس کا خاتمہ اس لیے ممکن نہیں ہو پا رہا ہے کہ خود قانون کے پاس دار اس دلالی میں ملوث ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا ہوں کہ ہندوستانی پولس کا ہر عملہ اس دلالی میں شامل ہے مگر یہ بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے اپنے عہدہ سے انصاف کرنے والے ہیمنت کرکرے کے مقابل، ڈونجارا، کرنل پروہت اور راٹھور جیسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ صرف دار الحکومت دہلی میں ۳ر سال کی مدت میں ۵۰۰ر سو سے زائد پولس افسران مختلف جرائم کی پاداش میں پابند سلال کیے گئے ہیں۔ یہ انکشاف مرکزی وزیر مملکت برائے امورِ داخلہ ملا پالے رام چندرن نے پارلیمنٹ میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں کیا، جب کہ انہوں نے اس کی تفصیل بتانے سے گریز کیا ا انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ خاطی پولس والوں کے خلاف حکومت نے کیا اور کہاں تک کاروائی کی ہے، انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں ابھی معلومات حاصل کی جارہی ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا پولس کے جرائم کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے حالاں کہ مذکورہ اعداد وشمار سے کچھ اور ہی کہانی سامنے آرہی ہے۔ کیوں کہ ایک عام شہری کے مقابل ایک پولس افسر کبھی اپنہ عہدہ کا ناجائز استعمال کرکے اور کبھی اپنے اوپر والوں کی جیب گرم کرکے بڑا سے بڑا جرم بھی آسانی کے ساتھ چھپا سکتا ہے۔ جو جرم سنگین ہوتا ہے اور اس پر پردہ ڈالنا مشکل ہو جاتا ہے وہی سامنے آتا ہے ورنہ عام طور سے پولس افسران کے جرائم کہانی سامنے آکر بھی پردہ خفا میں





ہی رہتی ہے۔ ظاہری بات ہے مذکورہ اعداد وشمار اسی رپورٹ کو سامنے رکھ تیار کیے گئے ہیں۔

پولس افسران کے جرائم کی یہ تعداد تو صرف دہلی کی ہے، دیگر صوبوں کے افسران کی کیا حالت ہوگی اس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ ایک سیمپل سروے مطابق ہندوستانی پولس کا ہر تیسرا فرد کسی نہ کسی جرم میں ملوث ہے۔ قومی کمیشن برائے حقوقِ انسانی (این ایچ آر سی) کے مطابق ہر دوسرا پولس انکاؤنٹر فرضی ہوتا ہے۔ کمیشن کے مطابق اکتوبر ۱۹۹۳ء سے اب تک ہندوستان میں ۲۵۶۰ر پولس انکاؤنٹر کے معاملات سامنے آئے ہیں جن میں سے ۱۲۲۴ر انکاؤنٹر فرضی ہیں۔

واضح رہے کہ این. ایچ. آر. سی. کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ سولہ برسوں میں سب سے زیادہ فرضی انکاؤنٹر کے واقعات یو. پی. میں ہوئے جب کہ دوسرا نمبر بہار اور تیسرا مقام آندھرا پردیش کا ہے۔ اتر پردیش میں ۷۱۶ر پولس انکاؤنٹروں میں سے ۱۳۱ر معاملوں میں مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا ہے، جب کہ گجرات میں ۲۰ر پولس انکاؤنٹر کے معاملات سامنے ہیں جن میں تقریباً نصف انکاؤنٹروں میں مسلمانوں کو مارا گیا، خیال رہے کہ فرضی انکاؤنٹر کی یہ تفصیل ایف. آئی. آر. درج ہونے والے معاملات کو سامنے رکھ کر تیار کی گی ہے۔

ہم روزمرہ پیش آنے والے پولس کے افعال وکردار کے آئینے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے اندر تعصب وعناد، ظلم وتشدد اور لوٹ مار کا عنصر ایک عام شہری کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آزادی بعد سے ملک میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں ہندوستانی پولس کا جو رول رہا ہے اور حالیہ چند برسوں سے دہشت گردی کے نام پر جس طرح کی جانب داری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ یہاں کی پولس کے پس پردہ کوئی ایسی لابی سرگرم ہے جو ہندوستان کو نفرت کے انگارے میں ڈھکیل کر اس کی جمہوریت ہی نہیں بلکہ اس کے وجود کو بھی تباہ کرنا چاہتی ہے۔

ہندتوادی دہشت گرد تنظیم ''ابھینو بھارت'' کی ماسٹر مائنڈ سادھوی پرگیہ سنگھ ٹھاکر اور کرنل پروہت کے لیپ ٹاپ سے برآمد ہونے والے اس کے خطرناک عزائم کے پس منظر میں یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے، اور ان تنظیموں کے تعلق سے حکومت اور پولس کے نرم وست رویہ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں حکومت اور قانون کا سایہ اس کو حاصل ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کسی ثبوت کے بغیر محض شک وشبہ کی بنا پر سیمی پر پابندی عائد کی جاسکتی ہے، اس کے اراکین کو گرفتار کیا جاسکتا ہے اور درجنوں شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی ابھینو بھارت، رام سینا، آر ایس ایس، اور سنگھ پریوار اور اس کے اراکین کو کھلی چھوٹ حاصل ہے۔ انصاف کا یہ دوہرا پیمانہ ہندوستان کی ترقی کی رفتار کو نہ صرف ست کرسکتا ہے بلکہ اس کے شیرازے کو منتشر بھی سکتا ہے۔

اتنا تو طے ہے جب تک حکومت پولس اور دوسرے اداروں میں اصلاح نہیں کرتی اس وقت تک ہندوستان کو ایک شفاف جمہوریت کے حامل ملک کی صف میں شامل کرنا کافی دشوار ہوگا۔

............☆☆☆☆............

گوشۂ ادب

آخری قسط

# مثنوی معنوی اور فلسفیانہ مسائل

مہتاب پیامی

اس ذوق کے متعلق عام طور پر دو نظریات عوام میں مقبول ہیں: اول یہ کہ پانی سے بھری بالٹی جب کنویں سے کھینچی جاتی ہے تو جب تک وہ پانی میں رہتی ہے تب تک اس کا وزن کم رہتا ہے، لیکن پانی سے باہر آنے کے بعد اس کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ پانی سے بالٹی کے الگ ہوتے ہی کنویں کا پانی بالٹی کے پانی کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے جس کے سبب زیادہ وزن محسوس ہوتا ہے۔ اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جب کسی جنازے کو آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا جاتا ہے تو اس کا وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے اور جنازہ لے جانے والوں کی رفتار بھی خاصی تیز ہوتی ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ جان بوجھ کر تیز قدم بڑھاتے ہوں بلکہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب تک انسان کے خاکی بدن میں روح کا قیام رہتا ہے وہ زمین پر باحیات ہوتا ہے۔ روح آسمانی شے ہے اس لیے آسمان اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور جسم خاکی ہے اس لیے زمین اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دونوں کی اس کھینچا تانی سے توازن برقرار رہتا ہے۔ مگر جب انسان کا بدن روح سے خالی ہو جاتا ہے تو زمین اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی توازن نہیں ہوتا، نتیجۃً جنازہ بھاری معلوم ہونے لگتا ہے اور لوگ تیزی سے اسے قبرستان کی طرف لے جانے کو مجبور ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا نظریات کے متعلق مولانا روم فرماتے ہیں۔

خاک گوید خاک تن را باز گرد　　ترک جاں گو سوے ما آ ہمچو گرد

جنس مائی پیش ما اولیٰ تری　　بہ کہ زاں تن وارہی زیں سو پری

تری تن را بجویند آبہا　　کاے تری باز آ ز غربت سوے ما

گرمیِ تن را ہمی خوانند اثیر　　کہ ز ناری راہِ اصلِ خویش گیر

(مثنوی معنوی ج3 /ص420)

مٹی جسم کی مٹی سے کہتی ہے کہ واپس آ جا، جان کو ترک کر اور گرد کی طرح ہماری جانب آ، تو ہماری جنس سے ہے اس لیے بہتر ہے کہ تو ہمارے ساتھ رہ اور اس جسم کو چھوڑ دے۔ پانی جسم کی تری کو تلاش کرتا ہے کہ تری (نمی)! مسافرت سے ہماری جانب لوٹ آ۔ کرۂ نار بھی جسم کی گرمی اور حرارت کو پکارتا ہے کہ تو آگ ہے۔ اپنی اصل کا راستہ اختیار کر۔

جسمِ حیوانی کو عناصر اربعہ (خاک و باد اور آب و آتش) کا مرکب مانا جاتا ہے۔ ان عناصر میں سے ہر ایک کا کرہ ہے جو ان کا معدن و مخزن ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ عناصر اربعہ ہر وقت اپنے معدن کی جانب لوٹنا چاہتے ہیں۔ انھیں عناصر کا اتحاد زندگی ہے اور انتشار موت۔ بہ قول چکبست۔

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

مولانا روم فرماتے ہیں کہ تجاذب کا یہ سلسلہ یہیں تک نہی بلکہ۔

جملہ اجزاے جہاں زاں حکم پیش　　جفت جفت عاشقاں جفتِ خویش

ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ　　راست ہمچوں کہربا و برگ کاہ

آسماں گوید زمین را مرحبا　　با توام چوں آہن و آہن رُبا

(مثنوی معنی ج3 /ص418)

یعنی اس ازلی حکم کی وجہ سے دنیا کے تمام اجزا جوڑے جوڑے ہیں اور اپنے جوڑے کے عاشق ہیں۔ دنیا میں ہر چیز جوڑے کی طلب گار ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے کہربا یعنی مقناطیسی پتھر گھاس یا تنکے کو اپنی جانب کھینچتا ہے اور آسمان زمین سے کہتا ہے کہ میں تیرے لیے ایسا ہوں جیسا لوہا مقناطیس کے لیے ہوتا ہے۔

اس بات کی وضاحت میں مزید فرمایا۔

ذرہ ذرہ کاندریں ارض و سماست　　جنس خود را ہر یکے چو کہرباست

معدہ ناں را می کشد تا مستقر　　می کشد مر آب را تف جگر

چشمِ جذاب بتاں ایں کو بہا　　مغز جویاں از گلستاں بو بہا

(مثنوی معنوی ج6 /ص281)

یعنی زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ اپنی جنس کے لیے باعث کشش ہے (اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں) معدہ روٹی کو ٹھہراؤ کی جگہ تک روکتا ہے اور جگر کی حرارت پانی کھینچتی ہے۔ آنکھ ان کوچوں سے معشوقوں کو کھینچنے والی ہے اور دماغ چمنوں سے خوشبوؤں کا جویاں ہے۔

جلد پنجم میں مولانا کے مقصد کی وضاحت ہوتی ہے۔

قہر و لطفے چوں صبا و چوں وبا　　آں یکے آہن ربا ویں کہربا

میکشد حق راستاں را تا رشد　　قسمِ باطل باطلاں را میکشد

معد حلوائی بود حلوا کشد　　معدہ صفرائی بود سرکہ کشد

فرشِ سوزاں سردی از جالش برد　　فرشِ افسردہ حرارت را خورد

دوست بینی از تو رحمت می جہد　　خصم بینی از تو سطوت می جہد

نور بینی روشنی بیروں جہد　　نار بینی یا دُخاں ظلمت دہد

خصم و یار و نور و نار و فخر و عار　　تخت و دار و برد و حار و ورد و خار

مور و مار و پود و تار و زیر و زار　　ہر یکے با جنس خود بر می شمار

(مثنوی معنوی ج5 /ص219)

قہر اور مہر صبا اور وبا کی طرح ہے، ایک مقناطیس اور یہ کہربا ہے۔ اللہ سچوں کو ہدایت کی جانب کھینچتا ہے۔ باطل فریق برے لوگوں کو کھینچتا ہے۔ حلوے والا معدہ ہو تو حلوے کو کھینچتا ہے، صفرے والا معدہ ہو تو سرکہ کو کھینچتا ہے۔ گرم فرش بیٹھنے والے کی ٹھنڈک دور کر دیتا ہے ٹھنڈا فرش گرمی کو کھا جاتا ہے۔ تو دوست کو دیکھتا ہے تو تجھ سے رحمت ٹپکتی ہے اور دشمن کو دیکھتا ہے تو دبدبہ۔ تو نور دیکھتا ہے تو روشنی باہر آتی ہے، آگ اور دھواں دیکھتا ہے تو تاریکی پیدا ہوتی ہے۔ دشمن و دوست، نور و نار، فخر و عار، تخت و دار، گل و خار، سرد و گرم، مور اور سانپ، تانا اور بانا، گانا اور رونا ہر ایک کو اپنی جنس کے ساتھ دیکھ لے۔

یعنی اعیانِ ثابتہ میں جیسی جس کی استعداد ہے اُس کے مطابق اُس کا میلان ہے۔ دنیا میں ہر جنس کی کشش اپنے ہم جنس کی طرف ہے۔ معدے کا یہی حال ہے، دوست و دشمن کا یہی حال ہے، نور و نار کا یہی حال ہے۔

**تعلق اجسام**: مولانا روم فرماتے ہیں کہ دنیا میں جس قدر بھی اجسام ہیں سب کا ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طرح تعلق استوار ہے۔ مثلاً زمین کی پیداوار میں پانی اور مٹی کا باہم تعلق ہے حالاں کہ دونوں کی شکلیں جدا جدا ہیں۔ بہ قول رومی۔

نیست جنسیت ز روے شکل و ذات　　آب جنسِ خاک آمد در نبات

بادِ جنسِ آتش آمد دو قوام　　طبع را جنس آمدست آخر مدام

(مثنوی معنوی ج2 /ص120)

یعنی ہم جنس ہونا صورت اور ذات ہی کی وجہ سے نہیں ہے۔ زمین کی پیداوار میں پانی مٹی کی جنس ہو گیا۔ بناوٹ میں ہوا آگ کی جنس ہو گئی اور شراب آدمی کی طبیعت کی جنس۔

مولانا روم مثالیں دے کر سمجھا رہے ہیں کہ باہمی تعلق شکل و صورت کے اتحاد پر موقوف نہیں ہے مثلاً ہوا آگ کی طبیعت میں داخل ہے۔ یعنی اگر ہوا نہ ہو تو آگ فوراً بجھ جاتی ہے۔ جدید علمِ سائنس کے مطابق آکسیجن کا وجود جس طرح انسان کی زندگی کے لیے لازمی ہے اُسی طرح آگ کے لیے بھی ضروری ہے۔ یورپی سائنس داں اِس حقیقت کا پتہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں لگا سکے، جب کہ ہمارے اکابر علما اس حقیقت سے یورپ والوں کے مقابلے کئی سو سال پہلے واقف تھے اور اُن سے بھی ہزاروں سال پہلے مصر میں عہدِ فراعنہ کے حکما اور دانش ور اِس حقیقت سے واقف تھے۔ اس کا ثبوت وہ اہرام ہیں جن کے تہ خانوں کے دروازے ہزاروں سال پہلے بند کیے گئے تھے اور دروازے بند کرنے سے قبل اُن میں شمعیں اور مشعلیں روشن کر دی گئی تھیں۔ دروازوں کو Airtight کر دیا گیا تھا تاکہ باہر کی ہوا اندر داخل نہ ہو سکے اور اندر جتنی آکسیجن موجود ہے چراغ جلنے میں کام آ جائے۔ انجام کار اندر کی آکسیجن ختم ہوئی تو اندر خلا جیسی کیفیت طاری ہو گئی جس کی وجہ سے زیورات، تابوت، کپڑے، تعویذات اور دیگر اشیا جو فراعنہ کی لاشوں کے ساتھ رکھی گئی تھیں، صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی محفوظ رہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جب اُن مقبروں کی تلاش کی عالم گیر مہم شروع ہوئی تو محض اس آکسیجن کی تکنیک کے سبب جدید سائنس دانوں کو ان دروازوں کو کھولنے میں بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ سمجھ سکتے ہیں یورپ کے جدید نظریات دراصل جدید نہیں ہیں اور ان تمام نظریات کی ڈور ہماری قدیم تاریخ اور ہمارے اکابر علما سے ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔

جلد ششم میں تعلقِ اجسام کی تصریح ملاحظہ فرمائیے۔

ایں جہاں جنگ است وکل چوں بنگری　　ذرہ با ذرہ چو دیں با کافری

شعبۂ کمپیوٹر، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور
payamee@gmail.com

اُ یکے ذرہ ہمی پرّد بچپ
ذرۂ بالا و آں دیگر نگوں
جنگِ فعلی ہست از جنگِ نہاں
ذرہ کاں محو شد در آفتاب
چوں ز ذرہ محو شد نفس و نفَس
رفت از وے جنبشِ طبع و سکون
ما بہ بحرِ نورِ خود راجع شدیم
در فروغِ راہ اے ماندہ زغول
جنگِ ما و صلحِ ما در نورِ عین
جنگِ طبعی، جنگِ فعلی جنگِ قول
ایں جہاں زیں جنگ قائم می بود
چار عناصر چار استونِ قوی ست
ہر ستونے اشکنندہ آں دگر
پس بنائے خلق بر اضداد بود

واں دگر سوئے یمیں اندر طلب
جنگِ فعلی شاں بہیں اندر رکوں
زیں تخالف آں تخالف را بداں
جنگِ او بیروں شد از وصفِ حساب
جنگش اکنوں جنگِ خورشید ست و بس
از چہ از انا الیہ راجعون
وز رضاع اصلِ مسترضع شدیم
لاف کم زن از اصول اے بے اصول
نیست از ما ہست بین الاصبعین
درمیانِ جزو ہا حربیست ہول
در عناصر در نگر تا حل شود
کہ بر ایشاں سقفِ دنیا مستوی ست
استنِ آب اشکنندہ آں شرر
لاجرم جنگی شدند از ضر و سود

(مثنوی معنوی ج6 /ص19-18)

یعنی جب تو غور کرے تو یہ دنیا پوری جنگ ہے۔ ذرہ ذرے کے ساتھ ایسا ہے جیسا دین کافر کے ساتھ۔ ایک ذرہ بائیں کو اڑتا ہے تو دوسرا طلب میں دائیں جانب کو۔ ایک ذرے کا رخ اوپر کی طرف ہے تو دوسرے کا نیچے کی طرف، رجحان میں ان کی عملی جنگ دیکھ۔ ان ذروں میں باہمی کشمکش اور باہمی اختلاف ہے۔ ان ذروں کی عملی جنگ مخفی جنگ کی وجہ سے ہے۔ اِس اختلاف کو اُس اختلاف کی وجہ سے سمجھ لے۔ وہ ذرہ جو سورج میں فنا ہوا اس کا نفس اور سانس ختم ہوگئی، اس کی جنگ حساب سے خارج ہوگئی، اب وہ محض سورج کی جنگ ہے۔ یعنی ذرے کے محو ہو جانے کے بعد اس کے افعال سورج کی طرف منسوب ہوں گے۔ اسی طرح دنیا کے تمام اجزا میں خوف ناک قسم کی طبعی، عملی اور قولی جنگ قائم ہے اور یہ جنگ بقائے عالم کا سبب ہے۔ عناصر، اربعہ اس کی بہترین مثال ہیں کہ ان میں آپس میں تضاد ہے اور ان کے تضاد کے سبب پیدا ہونے والی کشمکش سے توازنِ حیات باقی رہتا ہے، جس سے زندگی باقی رہتی ہے اور جہاں یہ عناصر اپنی اصل کی جانب لوٹتے ہیں، دنیا سے زندگی فنا ہو جاتی ہے۔ (اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہے)

**تجددِ امثال**:- مولانا روم فرماتے ہیں۔

از سخن صورت بزاد و باز مرد — موج خود را باز اندر بحر برد
صورت از بے صورتے آمد بروں — باز شد کہ انا الیہ راجعون
پس ترا ہر لحظہ مرگ و رجعتے ست — مصطفیٰ فرمودہ دنیا ساعتے ست
فکر ما تیرے ست از ہو در ہوا — در ہوا کے پاید آید تا خدا
ہر نفس نو می شود دنیا و ما — بے خبر از نو شدن اندر بقا
عمر ہمچوں جوئے نو نو میرسد — مستمرے می نماید در جسد
آں ز تیزی مستمر شکل آمدست — چوں شرر کش تیز جنبانی بدست
شاخِ آتش از بجنبانی بساز — در نظر آتش نماید بس دراز
ایں درازی مدت از تیزیِ صنع — می نماید سرعت انگیزیِ صنع

(مثنوی معنوی ج1 /ص141)

بات سے صورت پیدا ہوئی اور پھر مرگئی۔ موج اپنے آپ کو پھر سمندر میں لے گئے، صورت ایک بے صورت سے پیدا ہوئی پھر لوٹ گئی کہ ہم اسی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پس تیرے لیے ہر لمحہ موت اور واپسی ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا ایک گھڑی کی ہے۔ ہمارا خیال ایک تیر ہے جو اللہ کی جانب سے ہوا میں ہے۔ ہوا میں کب تک ٹھہرے؟ خدا کی طرف لوٹتا ہے۔ ہر دم دنیا نئی ہو جاتی ہے اور ہم زندگی میں اس کے نئے ہونے سے بے خبر ہیں نہر کی طرح۔ (تیری) عمر نئی نئی آتی رہتی ہے جو جسم میں لگا تار نظر آتی ہے۔ تیزی کی وجہ سے وہ لگا تار شکل بنی ہے، اس انگارے کی طرح جس کو تو ہاتھ سے تیز گھمائے۔ اگر تو جلدی لکڑی کو کوشش سے گھمائے تو وہ بہت لمبی آگ نظر آئے گی۔ ایجاد کی تیزی سے یہ بقا کا طول اللہ تعالیٰ کی ایجاد کی تیزی کو ظاہر کرتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ آواز خارج ہوتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے اور اُسی طرح دریا کی موج اٹھتی ہے، پھر دریا میں فنا ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ یعنی اس دنیا میں تجددِ امثال کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، ہر آن ہر چیز فنا ہوتی ہے اور اسی جیسی اس کے قائم مقام بن جاتی ہے۔ صرف آواز اور کلام ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر چیز میں تجددِ امثال ہو رہا ہے۔ (باقی ص: ۴۷ پر)



جادہ و منزل

# حضرت امین ملت مدظلہ کے علمی، دینی اور تبلیغی اسفار

محمد اکبر علی قادری

خانوادۂ برکات کی یہ امتیازی شان رہی ہے کہ یہاں سے ہمیشہ علم اور اہل علم کی خدمات انجام دی جاتی رہی ہیں۔ رشد و ہدایت، دعوت و تبلیغ اس خانقاہ کا نصب العین ہے۔ بزرگانِ مارہرہ نے اپنے کردار و اطوار اور طریقۂ تبلیغ سے نہ صرف ماضی میں زمانے کو متاثر کیا بلکہ دور حاضر میں اراکین خانوادہ اپنی تمام روایات کے ساتھ اسلام اور سنیت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ملت کے مسائل کے حل اور علم کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنی گراں قدر صلاحیتوں اور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

موجودہ صاحبِ سجادہ و ممبر منتظم و صدر انتظامیہ کمیٹی درگاہ حضرت سید شاہ برکت اللہ قدس سرہٗ حضرت امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری برکاتی دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے اکابر اور اسلاف کے مشن اور خانوادۂ برکات کی عظیم روایات کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس میں چار چاند لگائے، حضرت والا باوجود اپنی طبیعت کی ناسازی مذہب و مسلک کی تبلیغ اور تعلیم کو عام کرنے کا پیغام لے کر ملکی و غیر ملکی تبلیغی اسفار فرما رہے ہیں اور الحمد للہ حضرت والا کی کاوشیں رنگ لا رہی ہیں۔ ان کے مریدین و متوسلین اور چاہنے والے ان کی دعوت اور ان کے پیغام پر لبیک کہہ رہے ہیں اور اپنے اپنے طریقے سے مصروف عمل ہیں اور خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حضرت والا نے پچھلے چھ مہینوں میں دور دراز کے علاقوں میں کافی دورے کیے۔ دین اسلام اور مسلک کے پیغام کو عام کیا۔ انہیں اسفار کی روداد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

۳ر جنوری ۲۰۱۰ء کو دہلی سے صبح احمد آباد کے لیے روانگی ہوئی احمد آباد ایئرپورٹ پر مولانا عبدالستار ہمدانی موجود تھے سید جہانگیر صاحب کے گھر قیام کیا۔ بشائر الخیرات کی رسم اجرا ہوئی، سہ پہر کو بھاؤ نگر کے لئے روانگی ہوئی، برادر طریقت صادق برکاتی کے گھر قیام ہوا، رات کو شہید اعظم کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولانا مجیب اشرف صاحب اور مولانا عبدالستار ہمدانی صاحب کی تقاریر ہوئیں گونڈل اور پوربندر وغیرہ سے کثیر احباب آئے۔

۴ر جنوری ۲۰۱۰ء کو بھاؤ نگر اپولو ہوٹل میں علمائے کرام کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت حضرت امین ملت نے کی۔ اہل سنت و جماعت کو درپیش مسائل کے بارے میں غور و خوض ہوا بھاؤ نگر میں کثیر تعداد میں خواتین و حضرات داخل سلسلہ ہوئے۔

شام کو احمد آباد واپسی پر سید جہانگیر صاحب کے گھر بہت سے احباب ملاقات کے لیے آئے رات کو حضرت دہلی آ گئے اور حسنین برکاتی کے گھر قیام کیا۔

۹ر جنوری ۲۰۱۰ء کی صبح دہلی سے بذریعہ طیارہ بنگلور روانگی ہوئی صبح کو بنگلور ہوائی اڈے پر پرانے علیگ محمد علی فاروقی صاحب تشریف لائے اور ان کے دولت کدے پر ظہرانہ ہوا سہ پہر چار بجے داون گیرے روانگی ہوئی رات کو داون گیرے پہنچنے پر ہزاروں افراد نے جو شام ہی سے مسجد اور سڑکوں پر جمع تھے، حضور امین الملت کا استقبال کیا اور رات کو شہدائے کربلا کانفرنس میں حضرت والا کا تفصیلی خطاب ہوا، ممبئی سے مولانا سید عبدالجلیل بھی تشریف لائے۔ ملنگ برکاتی اور احباب کمیٹی شہدائے کربلا کانفرنس داون گیرے، بنگلور نے حضرت امین ملت مدظلہ العالی کو عکسِ گنبد سرکارِ غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ خالص چاندی میں ڈھلا ہوا نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب جس کی ظاہری قیمت ہزاروں روپے کی مالیت ہے، نذر کیا، جس کو حضرت امین ملت نے مجھے راقم الحروف محمد اکبر قادری اور ڈاکٹر فہیم عثمان صدیقی کو گواہ بنا کر البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کو تحفۃً پیش کر دیا۔

۱۰ر جنوری ۲۰۱۰ء کو داون گیرے سے بنگلور کے لیے راونگی ہوئی ہزارہا افراد داخل سلسلہ ہوئے رات کو ۸ بجے بذریعہ طیارہ دہلی پہنچ کر حسنین برکاتی کے گھر قیام ہوا۔

۲۱ر جنوری ۲۰۱۰ء کو دہلی سے بذریعہ ٹیکسی شرف ملت سید محمد اشرف میاں مدظلہ العالی اور حسنین برکاتی کے ساتھ جے پور کے لیے روانگی ہوئی۔ جے پور میں سید محمد افضل میاں برکاتی موجود تھے۔ رات کو برادر طریقت حاجی عبدالحمید کاغذی برکاتی کا فاتحہ چہلم ہوا جس میں قرب و جوار کے علمائے کرام کے علاوہ بیرونی علما بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت نے مرحوم حاجی عبدالحمید کے ان کے پیر خانہ اور مرشد برحق حضور احسن العلما علیہ الرحمہ سے تعلقات پر تفصیلی تقریر فرمائی اور

قادری مسجد، کبیر کالونی، علی گڑھ

سیکڑوں احباب داخل سلسلہ ہوئے۔

۲۲؍جنوری ۲۰۱۰ء کو جے پور میں برادر طریقت عبدالعزیز سنی بھی ممبئی سے آکر ملے۔ دوپہر اجمیر مقدس حاضری ہوئی اور وکیل مارہرہ سید مغیث میاں قادری چشتی کے دولت کدہ عظیم منزل میں قیام ہوا دہلی سے حضور رفیق ملت اور برادر طریقت آصف شیخا بھی آ گئے شام کو حضرت مع سہ برادران مزار مقدس پر حاضر ہوئے رات اجمیر شریف میں حاضری رہی۔

۲۳؍جنوری ۲۰۱۰ء کو اجمیر مقدس سے برادر طریقت عبدالعزیز سنی کے ساتھ کوٹا کے لیے روانگی ہوئی سلوار شریف کی حاضری ہوئی، بوندی میں متعدد احباب سے ملاقات ہوئی رات کو کوٹا پہنچے۔

۲۴؍جنوری ۲۰۱۰ء کوٹا میں صبح کو مدرسہ تنظیم اہل سنت کا سالانہ جلسہ ہوا جس کی نظامت برادر طریقت محمد جمیل مغل برکاتی نے کی۔ رات کو کوٹا شہر میں شہید اعظم کانفرنس کا عظیم الشان اجلاس ہوا، اندور سے مولانا انوار احمد برکاتی تشریف لائے۔ حضرت والا نے فلسفہ شہادت اور امام اعلیٰ مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہل بیتِ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر تفصیلی خطاب فرمایا سیکڑوں افراد داخل سلسلہ بھی ہوئے۔

۳۱؍جنوری ۲۰۱۰ء کو علی گڑھ کی مشہور زرعی اور صنعتی نمائش میں ضلع ادیوگ منڈل نے حضرت کو نشان امتیاز دیا۔

۵؍فروری ۲۰۱۰ء کو علی گڑھ سے دہلی ہوتے ہوئے حضرت مع شرف ملت ممبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔

۷؍فروری ۲۰۱۰ء ممبئی کے نواحی علاقے میرا روڈ میں امام احمد رضا کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں سرکار امین ملت نے مسلک اعلیٰ حضرت پر سیر حاصل خطاب فرمایا اور وہیں ایک غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوا اور حضرت امین ملت کے ہاتھوں پر سلسلہ قادریہ سے وابستہ ہوا۔

۱۱؍فروری ۲۰۱۰ء کو حضور والا صاحب زادگان گرامی قدر سید محمد امان اور سید محمد عثمان کے ساتھ بریلی شریف کے لیے روانہ ہوئے۔ بدایوں شریف میں حضور رفیق ملت، قاری محمد عرفان، قاری محمد کوثر بھی مل گئے۔ اسلامی کالج کے وسیع وعریض میدان میں مجدد اعظم امام احمد رضا برکاتی علیہ الرحمہ کے قل شریف کی محفل ہوئی لاکھوں کے مجمع کے درمیان اور سیکڑوں علمائے کرام کی موجودگی میں حضور والا نے فاضل بریلوی کی علمی اور ادبی خدمات پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔

۱۳؍فروری ۲۰۱۰ء کو حضرت والا مع سید محمد امان میاں ولی عہد سجادہ آستانہ عالیہ قادریہ کے ساتھ کانپور روانہ ہوئے۔ رات کو حلیم کالج میں "یوم مرشد اعظم" کا انعقاد ہوا جس میں حضور والا نے حضور احسن العلما علیہ الرحمہ اور برکاتیت کے موضوع پر طویل خطاب فرمایا جلسہ کے بعد سیکڑوں افراد داخل سلسلہ ہوئے۔

۱۴؍فروری ۲۰۱۰ء کو برادران طریقت لئیق برکاتی، عنایت برکاتی، ماسٹر شاہد برکاتی کے ساتھ لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گئے۔ سہکارتا بھون میں آل انڈیا مسلم کنونشن کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا ادریس بستوی، مولانا غلام عبدالقادر یار علوی سجادہ نشین براؤں شریف، مفتی عبدالحلیم فرنگی محلی اور بہت سے علما موجود تھے۔ مسلمانوں کے عصری مسائل پر حضور امین ملت نے تفصیلی گفتگو کی۔ ظہرانے کے لیے حضرت برادر طریقت مسرور فاروقی کے دولت کدے پر تشریف لے گئے۔

۲۰؍فروری ۲۰۱۰ء کو حضرت سنبھل کے لیے روانہ ہوئے مفتی اعظم راجستھان مفتی محمد اشفاق حسین کی پوتی بنت الحاج معین الدین کا نکاح حضرت نے پڑھایا۔ رات کو سرائے ترین میں برادر طریقت نجم الحسن برکاتی کے گھر قیام رہا۔ متعدد افراد داخل سلسلہ ہوئے۔

۱۱؍مارچ ۲۰۱۰ء کو علی گڑھ کے آفتاب ہال میں منعقد جلسہ عید میلاد النبی ﷺ میں حضور امین ملت اور مولانا نعمان ازہری نے خطاب فرمایا۔ ۱۵؍مارچ ۲۰۱۰ء کو علی گڑھ کے کنیڈی ہال میں M.S.O کا سالانہ جلسہ رحمت عالم کانفرنس منعقد ہوا جس میں پروفیسر شمیم منعمی سجادہ نشین میتن گھاٹ پٹنہ اور حضرت نے سیرت طیبہ ﷺ کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالی۔ ۱۹؍مارچ ۲۰۱۰ء کی رات حضرت ممبئی پہنچے 20.3.10 کو برادر طریقت عنایت اللہ برکاتی کے صاحبزادے کرامت اللہ برکاتی کا نکاح محبوب سبحانی مسجد کرلا میں پڑھایا۔ ۲۱؍مارچ ۲۰۱۰ء کو حضرت والا کرامت اللہ برکاتی کے ولیمہ میں شرکت فرما کے رات میں دہلی آ گئے اور حسنین برکاتی کے گھر مقیم ہوئے۔

۲۲؍مارچ ۲۰۱۰ء کو دہلی کی غالب اکاڈمی میں حضرت سیدنا ابراہیم ایرجی قدس سرہٗ کا عرس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ کاردار کے زیر سرپرستی منعقد عرس میں حضور امین ملت نے صاحب عرس کے سلسلے میں طویل خطاب فرمایا۔

۳۱؍مارچ ۲۰۱۰ء کو حضرت والا مارہرہ مطہرہ حاضر ہوئے بعد نماز عشا حضور احسن العلما علیہ الرحمہ کا فاتحہ قل منعقد ہوا۔ ملک کے کونے کونے سے ہزاروں احباب حاضر تھے حضور والا نے اپنے والد ماجد حضرت سید شاہ مصطفےٰ حیدر حسن میاں قادری برکاتی علیہ الرحمۃ کی سیرت پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔

۱؍اپریل ۲۰۱۰ء کو مولانا سبحان رضا خاں سبحانی میاں زیب سجادہ





آستانہ عالیہ رضویہ تشریف لائے۔ مولانا عبدالستار ہمدانی، مولانا انوار احمد اندوری کی تقاریر کے بعد حضور صاحب سجادہ حضرت امین ملت نے تفصیلی خطاب فرمایا۔ ۳؍اپریل ۲۰۱۰ء کی دوپہر حضرت والا بہار کے شہر چھپرہ پہنچے رات کو قصبہ نگرہ میں کنز الایمان کانفرنس منعقد ہوئی۔ دارالعلوم رحمانیہ تیغیہ کے وسیع وعریض میدان میں ہزاروں کا مجمع تھا خواجۂ علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب نے بھی خطاب فرمایا۔ ۴؍اپریل ۲۰۱۰ء کو حضرت والا قریبی قصبہ کوپا گئے وہاں مدرسہ اور مسجد کا افتتاح کیا۔ رات کو کنز الایمان کانفرنس کا آخری اجلاس ہوا جس میں مولانا ابوالحسن حقانی اور حضرت نے مسلک اعلیٰ حضرت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ حضور امین ملت نے دارالعلوم رحمانیہ تیغیہ کے مہتمم مفتی عبدالحلیم کو سلسلہ عالیہ قادریہ کی خلافت واجازت سے نوازا سیکڑوں افراد داخل سلسلہ ہوئے۔

۸؍اپریل ۲۰۱۰ء کی شب میں نگلہ پٹواری علی گڑھ میں عید میلاد النبی ﷺ کا اجلاس ہوا جس میں مولانا صغیر احمد جوکھنپوری اور حضرت والا نے خطاب فرمایا۔ ۱۷؍اپریل ۲۰۱۰ء کو البرکات میں مجوزہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نصاب کے سلسلے میں میٹنگ منعقد ہوئی جس میں حضرت مولانا محمد احمد مصباحی پرنسپل جامعہ اشرفیہ، مفتی نظام الدین شیخ الافتا، پروفیسر غلام یحییٰ انجم، ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی، مولانا اسید الحق ولی عہد آستانہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف، مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی، مولانا نعمان ازہری، حضور شرف ملت ڈاکٹر فہیم صدیقی، احمد مجتبیٰ وغیرہ نے شرکت کی۔ حضور امین ملت کی زیر صدارت اس میٹنگ میں بہت اہم فیصلے ہوئے اور نصاب کی تیاری شروع کر دی گئی۔

۱۸؍اپریل ۲۰۱۰ء کو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سلسلے میں دوسری اہم میٹنگ حضور امین ملت کی زیر صدارت منعقد ہوئی، جس میں رفیقِ ملت حضرت سید شاہ نجیب حیدر میاں صاحب نائب سجادہ نشین درگاہ عالیہ قادریہ برکاتیہ بھی تشریف لائے۔ ۲۹؍اپریل ۲۰۱۰ء کو جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کی ڈرگ سوسائٹی نے حضور امین ملت کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا حضرت نے خدمت خلق کی اہمیت اور افادیت پر مفصل گفتگو کی۔ ۳۰؍اپریل ۲۰۱۰ء کو حضرت امین ملت دامت برکاتہم عرس حامدی میں شرکت فرمانے کے لیے مع صاحبزادہ سید محمد عثمان میاں بریلی شریف تشریف لے گئے۔ حضرت سبحانی میاں صاحب اور اُن کے احباب نے حضرت کا خیر مقدم کیا اور ان کی شرکت پر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ ساڑھے دس بجے قل شریف کی محفل میں شرکت کی اور قدرے آرام کرنے کے بعد حضرت نے محفل دستار بندی میں شرکت فرمائی اور حاضرین کو اپنے خطابِ نایاب سے نوازا۔☆

(ص: ۴۴ کا بقیہ) نہر کا پانی ہر آن بدل رہا ہے (جب کہ) نظر میں ایک ہی پانی ہے۔

مولانا قاضی سجاد حسین رقم طراز ہیں:

"تجددِ امثال، ہر چیز کا اُسی جیسا ہر آن نیا ہو جانا، حکما وصوفیہ ہر چیز کا منبع ومخرج اور مرجع ذاتِ واحد کو مانتے ہیں اور کائنات کی ہر چیز ہر آن اُسی ذات واحد سے کسب فیض کر رہی ہے، ہر چیز کے تمام قویٰ اور وجود کا منبع ذاتِ واحد ہے۔ چوں کہ کائنات کی ہر چیز فانی ہے،، اس کے قویٰ اور وجود ہر آن فنا ہو رہے ہیں اور جدید قوت اور وجود اُس ذاتِ واحد سے حاصل کر رہی ہے تو گویا کائنات کی ہر چیز، ہر آن اپنے موجودہ وجود اور قوت کو فنا کر دیتی ہے اور اسی جیسا ایک جدید وجود اور قوت حاصل کر لیتی ہے۔" (مقدمہ مثنوی جلد 4، ص4)

بہ قولِ شاعر ؎

دنیا کے لیے ذات نئی ہے میری
میرے لیے ہر آن نئی ہے دنیا

مولانا قاضی سجاد حسین مزید لکھتے ہیں:

"محسوسات میں اس کی مثال اس طور پر سمجھ لی جائے کہ بجلی کے ایک منبع سے وابستہ تمام قمقمے ہر آن ایک نیا کرنٹ منبع سے حاصل کرتے ہیں اور ان میں ہر آن پہلا کرنٹ ختم ہو کر نیا کرنٹ مرکز سے پہنچ جاتا ہے اور انا للّٰہ و انا الیہ راجعون سے اسی کی طرف اشارہ ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگرست

(مقدمہ مثنوی ج4/ص8)

اس طرح مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا روم کے فلسفیانہ نظریات جدید سائنسی نظریات کی بنیاد ہیں اور البتہ ان میں کچھ ترمیم کر لی گئی ہے اور انھیں جدید سائنسی ناموں سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ یورپ والوں کی سائنسی ترقی کا دراصل یہی واحد راز ہے کہ انھوں نے ہمارے اسلاف کی کتابوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور ہم انھیں طاقِ نسیاں میں سجا کر بھول گئے۔ آج قوم مسلم کی تعلیمی پس ماندگی اور جدید علوم سے ناواقفیت کا ایک بڑا سبب بھی یہی ہے۔

خیابانِ حرم

# ترانۂ اشرفیہ

فیاض ٹانڈوی

اہلِ مبارک پور نے ایسا علمی باغ لگایا ہے
جس کا شبھی ایماں والوں کے سر پہ مبارک سایہ ہے
جس نے احادیث و قرآں کا ڈنکا خوب بجایا ہے
وہ دینی تعلیمی مرکز درس گہِ اشرفیہ ہے
حافظِ ملت نے خود جس کو اپنے خون سے سینچا ہے
اے اشرفیہ زندہ باد، زندہ و پائندہ باد
حافظ ملت زندہ باد، آپ کی خدمت زندہ باد
زندہ و پائندہ باد

جس کے فیوضِ علم سے روشن ملک کا گوشہ گوشہ ہے
فیضِ نبی سے جس کا فیض اب یورپ تک جا پہنچا ہے
ہاں ہاں علم و عرفاں کا جو ایک حسیں فوارہ ہے
وہ دینی تعلیمی مرکز درس گہِ اشرفیہ ہے
حافظِ ملت نے خود جس کو اپنے خون سے سینچا ہے
اے اشرفیہ زندہ باد، زندہ و پائندہ باد
حافظ ملت زندہ باد، آپ کی خدمت زندہ باد
زندہ و پائندہ باد

حافظ ملت کی محنت نے کیسا رنگ دکھایا ہے
اک چھوٹے سے پودے کو پورا گلزار بنایا ہے
اللہ اللہ آج جہاں میں ہر سو جس کا چرچا ہے
وہ دینی تعلیمی مرکز درس گہِ اشرفیہ ہے
حافظِ ملت نے خود جس کو اپنے خون سے سینچا ہے
اے اشرفیہ زندہ باد، زندہ و پائندہ باد
حافظ ملت زندہ باد، آپ کی خدمت زندہ باد
زندہ و پائندہ باد

یاں سے فضیلت پانے والا علمی سورج بنتا ہے
درس حدیث و قرآں کی ضو اک اک دل میں بھرتا ہے
جو دنیا کو جینے کے آداب سکھاتا رہتا ہے
وہ دینی تعلیمی مرکز درس گہِ اشرفیہ ہے
حافظِ ملت نے خود جس کو اپنے خون سے سینچا ہے
اے اشرفیہ زندہ باد، زندہ و پائندہ باد
حافظ ملت زندہ باد، آپ کی خدمت زندہ باد
زندہ و پائندہ باد

جس نے نبی کی عظمت کا پرچم ہر سو لہرایا ہے
جس نے پیامِ سنتِ آقا گھر گھر تک پہنچایا ہے
مسلکِ اعلیٰ حضرت کا جو ایک حسیں سر چشمہ ہے
وہ دینی تعلیمی مرکز درس گہِ اشرفیہ ہے
حافظِ ملت نے خود جس کو اپنے خون سے سینچا ہے
اے اشرفیہ زندہ باد، زندہ و پائندہ باد
حافظ ملت زندہ باد، آپ کی خدمت زندہ باد
زندہ و پائندہ باد

جس کا فضیلت یاب مبلغ دنیا بھر میں پھیلا ہے
افریقہ، امریکہ میں بھی جس کا علمی چرچا ہے
نکہتِ ایماں سے جس نے ہر خطے کو مہکایا ہے
وہ دینی تعلیمی مرکز درس گہِ اشرفیہ ہے
حافظِ ملت نے خود جس کو اپنے خون سے سینچا ہے
اے اشرفیہ زندہ باد، زندہ و پائندہ باد
حافظ ملت زندہ باد، آپ کی خدمت زندہ باد
زندہ و پائندہ باد

جس کا ہر مصباحی عالم، علم کا اک مینارا ہے
لندن اور ہالینڈ میں بھی جو سورج بن کر چمکا ہے
مسلکِ اعلیٰ حضرت جس سے ملکوں ملکوں پھیلا ہے
وہ دینی تعلیمی مرکز درس گہِ اشرفیہ ہے
حافظِ ملت نے خود جس کو اپنے خون سے سینچا ہے
اے اشرفیہ زندہ باد، زندہ و پائندہ باد
حافظ ملت زندہ باد، آپ کی خدمت زندہ باد
زندہ و پائندہ باد

اہلِ مبارک پور کا یہ فیاض مبارک جلوہ ہے
اپنی زمیں پر علم کا جو ایسا گلزار سجایا ہے
جس کے گلوں نے نکہتِ دیں سے دنیا کو مہکایا ہے
وہ دینی تعلیمی مرکز درس گہِ اشرفیہ ہے
حافظِ ملت نے خود جس کو اپنے خون سے سینچا ہے
اے اشرفیہ زندہ باد، زندہ و پائندہ باد
حافظ ملت زندہ باد، آپ کی خدمت زندہ باد
زندہ و پائندہ باد



الٰہی مرا نورِ بصیرت عام کر دے
سلسلہ ٹوٹے نہیں

# یہ ہے میرا وطن

## ڈاکٹر شکیل اعظمی کا پہلوٹا مجموعۂ نعت "گلِ قدس"

مبارک حسین مصباحی

اردو نعتیہ شاعری کی بساط پر ایک سے ایک لعل و گہر پیدا ہوئے مگر جہانِ نعت گویاں میں امام احمد رضا بریلوی جیسا عشق و عرفان اور رنگ و آہنگ کہیں نظر نہیں آتا۔ تقسیم وطن کے بعد خاکِ ہند میں جو فرخندہ خصال ناعتانِ مصطفیٰ شہرت و مقبولیت کے بامِ عروج پر پہنچے ان میں بھی فکر رضا کا رنگ و آہنگ سب سے گہرا نظر آتا ہے۔ مولانا حسن رضا بریلوی، مفتی اعظم ہند بریلوی، تاج الشریعہ بریلوی، نظمی مارہروی، اشرف مارہروی، راز الہ آبادی، بیکل اتساہی وغیرہ شعرائے ہند کی خاصی طویل فہرست ہے جن کی نعتیہ شاعری کے آبگینوں میں نورِ رضا کا انعکاس صاف نظر آتا ہے۔ ماضی قریب میں رضاشناسی کے میدان میں ڈاکٹر شکیل اعظمی ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق اور ڈاکٹر صابر سنبھلی کے نام ابھرے، بلکہ اس وقت دیارِ ہند میں یہ عناصر اربعہ امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری کے معتبر حوالے ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر شکیل اعظمی کے اولین مجموعۂ نعت "گلِ قدس" سے میری چشم شوق منور اور میری روحِ فکر معطر ہے۔ میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ میرا باوضو قلم گلِ قدس کے رنگ و بو کو لفظوں کے دامن میں جذب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ شعر و ادب، نقد و نظر اور زبان و بیان کے حوالے سے ڈاکٹر شکیل اعظمی مفتی عصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اربابِ شعر و سخن اپنی گتھیاں سلجھانے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ رضا فہمی کے تعلق سے خاص طور پر ان کا قلم سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس لیے ہم یہ لکھنے میں حق بجانب ہیں کہ ہمارے عہد میں ان کا وجود غنیمت نہیں بلکہ ضروری ہے، درس گاہِ حافظِ ملت کے اس نام ور فرزند پر اگر آج جامعہ اشرفیہ کو فخر ہے تو اس میں غلط کیا ہے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ علمائے مدارس شاعری کے فنی رموز سے محفوظ ہوتے ہیں اور اربابِ شعر و سخن حریم شریعت کے آداب سے کم آشنا، جب کہ نعت نگاری کے لیے دونوں کا علم و عرفان ضروری ہے۔ ڈاکٹر شکیل اعظمی ان ممتاز اربابِ علم و ادب میں ہیں جن کے ایک ہاتھ میں علم شریعت اور دوسرے ہاتھ میں علم شعر و ادب ہے۔ اور دونوں کے آمیزے سے نعتیہ شاعری کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ڈاکٹر شکیل اعظمی کے قدِ زیبا سے کہیں زیادہ شکیل و وجیہ اور بلند قامت ہے۔ ڈاکٹر شکیل اعظمی کی نعتیں ملک اور بیرون ملک کے دینی اور ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں، اس کہنہ مشق اور معروف شاعر کا پہلوٹا مجموعۂ نعت اس وقت آپ کے روبرو ہے، جسے مصنف نے تمام تر شرعی احتیاطوں اور ادبی فن کاریوں کے ساتھ اپنے گل دانِ ادب میں سجا کر "گلِ قدس" کے نام سے پیش کیا ہے۔ گلِ قدس کے رنگ و آہنگ میں لہجے کی انفرادیت بھی ہے اور سخن طرازی کا بانکپن بھی۔ عشق رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا سوزِ دروں بھی ہے اور وارفتگی کا جذبۂ جنوں خیز بھی۔ حریم قدس کے گلِ قدس کی رونمائی سے پہلے آیئے چند لمحوں کے لیے مصنف کی محفل میں چلتے ہیں کہ سنا ہے: ع: ان کی محفل میں بیٹھنے والا آدمی خوش نصیب ہوتا ہے

ڈاکٹر شکیل اعظمی اکہرے بدن کے نستعلیق اور انتہائی پرکشش شخصیت کے مالک ہیں، نازک مزاج، بلند خیال اور مضبوط فکر رکھتے ہیں۔ وہ جب کسی موضوع پر گفتگو فرماتے ہیں تو بے تکان بولتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آج وہ خاص اسی موضوع پر تیاری کر کے آئے ہیں مگر ایسا نہیں۔ ان کے سامنے علمی، ادبی، شعری، سماجی، صحافتی اور ملی کسی بھی موضوع کو چھیڑ دیجیے اور پھر سراپا سماعت بن کر ہنکارے بھرتے رہیے۔ لغت میں کس لفظ کے کیا کیا معنیٰ آتے ہیں، کس لفظ کو کن کن شعرا نے اپنے اشعار میں برتا ہے، زیر بحث لفظ متروک ہو چکا ہے یا اس کا چلن باقی ہے، مستعمل ہے تو فصیح یا غیر فصیح۔ اپنے مدعا کے اثبات میں جب وہ قدیم اساتذہ کے اشعار پیش کرنے پر آتے ہیں تو لگتا ہے کہ غالب و میر کے قافلے کا کوئی فرد بھٹک کر ہمارے عہد میں چلا آیا ہے۔ گفتگو کیا کرتے ہیں، فکر و فن کے موتی رولتے ہیں۔ ان کی محفل میں بیٹھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ شریکِ محفل کے لیے حاضر دماغی، متانت و سنجیدگی اور وسعتِ مطالعہ ضروری ہے۔ طنز و مزاح اور شعر و ادب پر دسترس ہو تو نہایت ہی مستحسن ہے۔

ڈاکٹر شکیل اعظمی ذہین و فطین، وسیع المطالعہ، حالات شناس انتہائی حساس اور حد درجہ دور اندیش ہیں۔ نظافت و پاکیزگی آپ کے فکر و فن اور دامن حیات کا طرۂ امتیاز ہے۔ ستمبر ۱۹۴۳ء کو آپ گھوسی ضلع اعظم گڑھ (موجودہ ضلع مئو) میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور متوسطات تک تعلیم

مدرسہ شمس العلوم گھوسی اور مدرسہ فضل رحمانیہ پچپڑوا گونڈہ میں حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں داخل ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں مصباحیت کا تمغۂ امتیاز لے کر فارغ ہوئے۔ آپ کا تعلیمی ریکارڈ بتاتا ہے کہ آپ نے ہر ادارے اور ہر جماعت میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء میں یونانی میڈیکل کالج الہ آباد سے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ ایف. ایم. بی. ایس. کی ڈگری حاصل کی اور پھر اپنے خاندانی پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ اپنے وطن گھوسی میں مطب کا آغاز کیا جو شہرت و مقبولیت کے ساتھ آج تک جاری ہے۔

شعر و شاعری، افسانہ نگاری، انشا پردازی کا شوق آپ کو اوائل عمر ہی سے رہا ہے۔ گھر کا ماحول بھی علمی و ادبی رہا ہے۔ والدِ گرامی کے عہد ہی سے اہل علم و ادب کا گھر آنا جانا رہا۔ باکمال شعرا، ادبا اور مشاہیر علما کی صحبتوں سے بھی آپ کے فن کو جلا ملتی رہی۔ ابتدائی چند غزلوں اور نظموں پر نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے اصلاح لی، لیکن افسوس کہ موصوف کا اصلاح کردہ کلام ڈاک کی بدنظمی کی نذر ہو گیا۔ چند غزلوں اور نظموں پر جناب نشور واحدی سے اصلاح لی لیکن یہ سلسلہ بہت مختصر رہا۔ مسلسل مشق و ممارست، مطالعہ کی کثرت، شعری ذوقیت اور عصری حسیت نے آپ کو شعر و سخن کی اس بلندی تک پہنچایا۔ اس سب کے باوجود نعت نگاری میں آپ نے دبستانِ رضا سے بھرپور اکتسابِ فیض کیا۔ ڈاکٹر شکیل اعظمی نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے۔

میں لکھتا نعتِ مصطفیٰ، کہاں مری بساط تھی
رضا کا فیض ہے شکیل نوری التفات ہے

نعت نگاری صرف ایک فن نہیں سعادت مندی اور فیروز بختی کی علامت ہے اور اگر لفظوں میں جذبوں کی سچائی حلول کر جائے تو یہ عشق و ایمان کی معراج ہو جاتی ہے۔ شاعری فن سے مشروط وصف کا نام ہے جو حسن نہاں کی سحر طرازی، عشق وارفتہ کی شوریدہ سری اور فکر و نظر کی آوارگی کی کسی بھی منزل تک جا سکتی ہے اور آب رنگ و آہنگ چہرے پر ردائے فن ہو تو شاہ کارِ ادب بھی ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقی نعت نگاری صرف شریفوں کا شیوۂ سخن ہے۔ یہاں فکر و معنٰی کی کج روی تو دور کی بات ہے، لفظوں کے پلکوں پر بھی شریعت کی سخت پہرے داری ہوتی ہے۔ کوچۂ عشق نبی میں اسی حد تک سرشاری کی اجازت ہے کہ دل و دماغ مکمل بیدار، خبر دار اور سراپا ادب ہوں۔ نعت نگاری میں فن شاعری کے تمام تر لحاظات کے باوجود بھی ھَلْ مِنْ مَزِیْد کی صدا گونجتی رہتی ہے۔ دبستانِ نعت میں لفظوں کے انتخاب، جملوں کی ساخت اور لہجے کے نشیب و فراز ہر ایک کے لیے قیود و شرائط ہیں۔ نعت نگاری کو قرآن و حدیث کے طے شدہ خطوط کے اندر ہی رہنا ہے، آگے بڑھتا ہے تو شرک کی کھائی ہے، پیچھے ہٹتا ہے تو خارجیت اور وہابیت کی دلدل ہے۔ گلزارِ نعت میں اذنِ حاضری کے لیے صرف ناعت کا طاہر ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ اس کی فکروں کا باوضو ہونا بھی ضروری ہے، اسی کے ساتھ جذبوں کی سچائی بھی لازمی ہے۔

نعت نگاری جب اپنے تمام محاسن سے مرصع ہو کر پیکرِ حسن میں ڈھلتی ہے تو وہ صرف ادب کی خدمت نہیں بلکہ مقدس عبادت بن جاتی ہے اور اگر اپنے ممدوح کی بارگاہ میں سندِ قبول پالے تو اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ قدسیانِ عرش بھی سر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور عش عش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شکیل اعظمی کا مجموعۂ نعت گلِ قدس حد نظر محاسن کا شاہ کار اور ایمان افروز مرقع جمیل ہے۔ اس ظہورِ گلِ قدس پر نہ مصنف کو اپنے فن کا غرہ ہے اور نہ مشق و ممارست کے طویل سفر پر آبلہ پائی کا احساس۔ انھیں "لا یمکن الثناء کما کان حقہ" کا بھرپور ادراک و شعور ہے اور بڑے سے بڑے نعت گو شاعر کی یہ آخری منزل ہوتی ہے۔ اس میدان میں خود فراموشی عشق اور فن دونوں کی معراج ہوتی ہے۔ سنیے وہ خود کیا کہتے ہیں۔

بہر سعادت کرتا ہوں کچھ وصفِ شہِ لولاک رقم
ہے کس میں شکیل اتنی طاقت کر دے جو بیاں اوصاف نبی
چند ٹوٹے پھوٹے جملے نذر لایا ہے شکیل
کاش مل جائے اسے حسان کا طرز بیاں

مگر اسی کے ساتھ مدحِ مصطفیٰ کی سرفرازی کا یہ پندار بھی ہے۔

جو لفظ بھی کرتا ہوں رقم وصفِ نبی میں
بن جاتا ہے وہ لفظ چمکتا ہوا موتی

ڈاکٹر شکیل اعظمی بارگاہِ رسول ﷺ کے آداب سے خود بھی آشنا ہیں اور ادب کی پاس داریوں کا پیغام اپنے عہد کو بھی دیتے رہتے ہیں۔

نظر میں رکھنا مقامِ نبی ضروری ہے
ادب میں آئے نہ کوئی کمی، ضروری ہے
نہ آئے جذبۂ ایماں پہ اپنے حرف کوئی
جنوں کے دور میں یہ آگہی ضروری ہے
شکیل نعتِ رسولِ کریم لکھنے کو
خیال و فکر کی پاکیزگی ضروری ہے

ڈاکٹر شکیل اعظمی از عرش نازک تر حریم قدس میں دل کی دھڑکن کو خلافِ ادب سمجھتے ہیں۔

ہے ادب لازم بہر صورت حریم قدس کا
کیوں دلِ دیوانہ تو پیہم دھڑکتا جائے ہے





نعت رسول صرف عروض و قوافی کے حسن اہتمام کا نام نہیں بلکہ ثنائے مصطفیٰ میں کیف و اثر کے لیے عشق میں صداقت بھی ضروری ہے۔ جذبوں کی سچائی اگر نعت نگار کے سیرت و کردار میں نمایاں نہ ہو تو نعت نبی کے بجائے بقول شکیل اعظمی لفظوں کا انبار لگتا ہے۔

عشق کا سچا جذبہ ہو تو کیف و اثر ہو شعروں میں
نعت کا ورنہ ہر اک مصرعہ لفظوں کا انبار لگے
عشق نبی میں سچا تجھ کو مانوں گا اس وقت شکیل
سیرتِ نبوی کا آئینہ جب تیرا کردار لگے

تاج دار کشور نعت حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے لے کر سلطانِ نعت گویاں امام احمد رضا بریلوی تک ناعتانِ مصطفیٰ نے گستاخانِ رسول ﷺ کی زجر و توبیخ کو نعتِ رسول کے موضوعات میں شامل رکھا ہے۔ غیرتِ عشق کا واجبی تقاضا بھی یہی ہے کہ عناد و نفاق کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کھڑی کی جائے۔ ناموسِ رسالت کے تحفظ کا یہ تیور قرآن عظیم میں بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ مدنی تاج دار ﷺ کو خلاقِ عالم نے جو معجزات و کمالات عطا فرمائے ہیں ان میں نقص تلاش کرنا یا اسلام کے طے شدہ عقیدۂ رسالت کے خلاف عقیدہ رکھنا یقیناً توہینِ رسول اور منصبِ رسالت کا خاموش انکار ہے۔ ڈاکٹر شکیل اعظمی نے اس رخ پر بھی بولتے ہوئے اشعار کہے ہیں جن میں غیرتِ عشق بھی ہے اور تردید باطل بھی، طنز لطیف بھی ہے اور لہجے کی نشتریت بھی۔

نبی سے بغض بھی اور نورِ ایمانی کا دعویٰ بھی.........کہاں سے روشنی ہو گی دلوں میں جب غبار آیا
کم نظر تعبیر اس کو جس طرح چاہیں کریں.........وقتِ مشکل میرے لب پر ان کا نام آ ہی گیا
اک ذرا سے ارتفاعِ صوت پر تیرے حضور.........بارگاہِ حق سے حکم احترام آ ہی گیا
ادب سے پڑھنے کو سرکارِ دو جہاں پہ سلام.........گناہ کیا ہے اگر ہم قیام کرتے ہیں
نبی کے توسل کا ہے فیض ورنہ.........دعا میں ہے کتنا اثر، جانتے ہیں
کچھ اس میں شک نہیں یہ حدیثِ رسول ہے.........دیتا خدا ہے اور عطا کر رہا ہوں میں

ڈاکٹر شکیل اعظمی کو امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا بھی بھرپور احساس ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ کی سچی غلامی اور نظامِ مصطفیٰ کی بالادستی کو تمام مسائل کا حل جانتے ہیں۔ آپ نے اپنی نعتوں میں اطاعتِ مصطفیٰ کا درس بھی دیا ہے اور یہ ایک ناقابلِ تردید سچائی بھی ہے کہ امتِ مسلمہ کے فکری ارتداد اور عملی بے راہ روی نے اسے باہمی انتشار اور تنزلی کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ نعتِ رسول کے ضمن میں ان مسائل کو بیان کرنا شاعر کی عصری حسیت اور اطاعت رسول کے بے پناہ جذبۂ شوق کی علامت ہے۔ اس حوالے سے ذرا ذیل کے اشعار دیکھیے۔

جو ہوتا تیری غلامی کا طوق گردن میں.........تو آج پاؤں کی ٹھوکر میں سروری ہوتی
خلافِ حکم پیمبر عمل و عشق رسول.........یہ ہم نے نفس کا کیسا فریب کھایا ہے
فرمانِ رسالت کو اگر سامنے رکھ لے.........ہر دور میں انسان کو آ جائے گا جینا
شکیل اربابِ دانش اک نہ اک دن مان ہی لیں گے.........کہ دینِ مصطفیٰ دنیا کے ہر اک دیں سے بہتر ہے
تفریق رنگ و نسل نہ ہو دیں کے نام پر.........اے ربِ کائنات دعا کر رہا ہوں میں
ہر زمانے کے لیے اک رہ نما دستور ہے.........کاش اپنا لیں جہاں والے نظامِ مصطفیٰ

گلِ قدس کے جلوؤں کا ایک شہرِ نور نگاہوں کے سامنے ہے، کہتے ہیں نور کی کثرت بھی کبھی کبھی نگاہوں کے سامنے پردہ بن جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے لیے گلِ قدس کے اوراق کی بھی ہے حسن انتخاب کیا انتخاب مشکل ہے۔ گلِ قدس کے ہر ورق پر نورِ مصطفیٰ ﷺ کے جلوے چھائے ہوئے ہیں۔

ہوا ہے عالمِ امکاں میں جب سے تیرا ظہور.........اندھیرا چھٹ گیا، پھیلا جہاں میں نور ہی نور
شفق کے رنگ میں، شمس و قمر میں تاروں میں.........کہاں کہاں نہیں پہنچا ترے جمال کا نور
حضور آپ کا احساں ہے نوعِ انساں پر.........کہ آ گیا اسے تہذیبِ زندگی کا شعور

مولائے کریم "گلِ قدس" کو قبولِ عام عطا فرمائے اور حضرت مولانا ڈاکٹر شکیل اعظمی دام ظلہ العالی کو عمر خضر عطا فرمائے، آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم۔

ہے نام محمد ہی نعتِ محمد
میں لکھ کر محمد قلم رکھ رہا ہوں

# صدائے بازگشت

یہ کالم ایک "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"۔ اس کے تحت علمی، فکری، تنقیدی اور تجزیاتی مراسلات کو ترجیح دی جائے گی۔

## مادرِ علمی کو یاد کر کے خون کے آنسو رواں ہیں

نازشِ قرطاس و قلم مولانا مبارک حسین مصباحی- سلام مسنون

آپ کی تحریر پڑھ کر دل کو نشاط اور آنکھوں کو ضیا ملتی ہے۔ ماہ نامہ کے تمام مضامین خوبیوں سے بھرپور اور مبارک و مسعود ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ قلبِ حزیں کی حالت کیا بیان کروں؟ مادرِ علمی کے آغوش سے جدا ہو کر ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار رہا۔ ایام اشرفیہ کو یاد کر کے دل سے اشک کی جگہ خون کے آنسو رواں ہوتے ہیں۔ میرے درد و الم، اضطراب و اضطرار اور حزن و غم کو محبت کے ترازو پہ وہی تول سکتا ہے جس نے کبھی مادرِ علمی سے فراق یا اپنوں کی وفات کا کڑوا جام پیا ہو۔ درِ حافظ ملت کی وہ بہاریں، اشرفیہ کا پر شوق نظارہ، اساتذہ کی پدرانہ شفقت، حضور عزیز ملت دام ظلہ کی خلوص و للّٰہیت سے لبریز زجر و توبیخ اور شفقت و عنایت سے بھرپور نصیحتیں آج بھی دل کے نہاں خانے میں زندہ و جاوید ہیں۔ قیام اشرفیہ کا وہ آخری دن اور آخری لمحے کا منظر نگاہوں سے رخصت ہونے کا نام ہی نہیں لیتا جب یکے بعد دیگرے تمام دوستوں کو رخصت کر کے خود دار الحدیث کے گنبد سے گزر کر صدر دروازہ کی طرف آیا اور درد انگیز آخری نگاہ اپنے علمی گہوارہ پہ ڈالی تو آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ مادرِ علمی سے بچھڑنے کا ملال، اساتذہ سے فراق کا حزن، دوست احباب کی جدائی کا احساس، غموں کی موجوں میں مزید طغیانی پیدا کرتا تھا۔ دل تڑپ رہا تھا اور ہل من مزید کی صدائیں لگا رہا تھا۔ مگر قدرت کا قانون ہی کچھ اور ہے۔ اس نے میرے علمی گہوارہ کے سمندر سے اکتسابِ فیض کا در سارے عالم کے لیے کھول رکھا ہے اور ہر ایک کو ایک مدتِ معینہ گزار کر اپنی نشست دوسروں کے لیے خالی کرنی پڑتی ہے تاکہ کل بروزِ قیامت کوئی علم کا شیدا بارگاہِ رب العزت میں حضور عزیز ملت مد ظلہ کے خلاف کوئی شکایت نہ کر سکے کہ مولیٰ مجھے عظیم علمی دانش کدے میں خوشہ چینی کا موقع نہیں دیا گیا۔ رب سے دعا گو ہوں کہ وہ اپنے حبیب کے صدقہ و طفیل مادرِ علمی کی بہاروں کی ملائکہ بالخصوص روح القدس کے ذریعے حفاظت فرمائے۔ اور ماہنامہ اشرفیہ کو یونہی دن دونی رات چوگونی ترقی عطا فرمائے۔ فقط

عنبر مصباحی، ایڈیٹر ماہنامہ "المصباح" کشمیر

## کیا شکوہ غم کیجیے اغیار کے آگے

جناب ایڈیٹر صاحب............ سلام مسنون

اپریل کا شمارہ علم و تحقیق کے گوہر لٹاتا ہوا باصرہ نواز ہوا، اداریہ خوب صورت ترتیب کے ساتھ علمی سفر کی روداد پیش کر رہا ہے، جسے بڑے دل چسپ پیرائے میں سپردِ قرطاس کیا گیا ہے، کہیں عقیدت کی باتیں، کہیں علما کے پاکیزہ مذاق کا بیان، کہیں عشائیے اور ظہرانہ سے شاد کام ہونے کا ذکر کیوں نہ ہو کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ رب العزت نے علمائے کرام کا رزق روئے زمین پر پھیلا دیا ہے۔

اس طرح کے خصوصی شمارہ سے علم و آگہی میں جو اضافہ ہوتا ہے، اسے فیضانِ حافظ ملت ہی کہہ سکتے ہیں۔ مدارس میں زیرِ تعلیم طلبہ ان شماروں میں شائع شدہ تحریر سے خاص طور سے استفادہ کر سکتے ہیں، اس سے عام اردو داں قارئین کا فائدہ یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے بطن سے پیدا ہونے والے مسائل کے سلسلے میں انھیں حکم شرعی معلوم ہو جائے گا، مگر طلبہ کو نہ صرف معلومات کا ذخیرہ میسر ہوتا ہے بلکہ تحقیق کا انداز، استدلال کا طریقہ اور فقہی جزئیات کو نوزائیدہ مسائل پر منطبق کرنے کا شعور بھی ملتا ہے۔ ذہن و فکر کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور خود میں استنباطِ مسائل کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ نوجوان علمائے کرام اس سلسلے میں دادِ تحقیق دے رہے ہیں۔ جامعہ اشرفیہ کا کاروانِ علم و فضل دین کی جو خدمات انجام دے رہا ہے یقیناً یہ حافظ ملت کی حسین چمن بندی کا ثمرہ ہے۔

رودادِ چمن کے کالم میں مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب کے پر مغز، معنیٰ خیز اور حقیقت پر مبنی خطاب کے چند گوشوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ہم اس بات سے متفق ہیں کہ یہ حقیقت لوگوں کے سامنے لانے کی سخت ضرورت ہے کہ امام اہل سنت مسئلۂ تکفیر





کے سلسلے میں انتہائی محتاط تھے۔ اغیار سے شکوہ غم سے کیا فائدہ؟ اعلیٰ حضرت کی عقیدت کا دم بھرنے والے خود اتنے غیر محتاط ہو گئے کہ بلا تحقیق ہی تکفیر و تفسیق کا طوفان کھڑا کیے ہوئے ہیں۔ اب ان سے اعلیٰ حضرت کی شناخت اس زاویے سے کرانے کی امید رکھنا تو بے معنیٰ ہے، اس لیے ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ "جو لوگ مسلکِ اعلیٰ حضرت کے نام پر اہل سنت میں انتشار اور زر اندوزی کی مہم چھیڑے ہوئے ہیں، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے" اور اپنے طور پر جو ہو سکے کام کرنا چاہیے۔ فقط

محمد عابد چشتی، جامعہ صمدیہ پھپھوند شریف، اوریا

## مسلم ریزرویشن وقت کا جبری تقاضا

قابل صد افتخار مدیر صاحب............ سلام مسنون

تازہ شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ جلوہ بار ہوا۔ ایک ہی نشست میں از ابتدا تا انتہا پڑھ ڈالا، بعد از خواند دل کو راحت و سکون حاصل ہوا، تمام مضامین خوب سے خوب تر پایا، خصوصاً آپ کا اداریہ "مسلم ریزرویشن وقت کا جبری تقاضا" نہایت ہی معلوماتی اور معیاری ہے، اس مضمون میں آپ نے غریب مسلمانوں کے کفر و ارتداد قبول کرنے کا جو ذکر کیا ہے، یہ بڑا افسوس ناک پہلو ہے، اس کے تدارک کے اسباب کیا ہوں گے، اس کی طرف قوم مسلم کے ذہن و فکر کو آپ کا قلم ہی مبذول کرا سکتا ہے۔ شمارہ میں "یہ ہے میرا وطن" کے کالم میں جامعہ اشرفیہ میں طلبہ کی طرف سے جشن یوم مفتی اعظم ہند کی تفصیل آپ نے بڑے اچھوتے انداز میں بیان فرمائی اور ڈاکٹر شجاع الدین صاحب کی تشریف آوری کا ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے توسیعی خطاب کے بجائے جو مقالہ پیش کیا ہے، اس کا ایک جز آپ نے پیش کیا۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب کا مقالہ اپنے موضوع پر نہایت ہی جامع و وقیع ہے۔ ماہ نامہ اشرفیہ میں قسط وار شائع کرنے کے بعد میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے کتابچہ کی شکل میں بدل دیا جائے۔ ایک مضمون "اسلام اور طریقۂ تبلیغ" کے عنوان سے حاضر خدمت ہے اگر شاملِ اشاعت ہو تو کسی قریبی شمارے میں شامل فرما لیں، کرم ہو گا۔ فقط- والسلام

محمد اصغر علی مصباحی، استاذ دار العلوم مجاہد ملت، دھام نگر، اڑیسہ

## فقہی سیمینار پر خصوصی شمارہ فردوسِ نگاہ بنا

پیکرِ اخلاص مکرمی جناب مدیر اعلیٰ صاحب....... سلام مسنون

امید کہ مزاجِ عالی بخیر ہوں گے۔

رسالہ اشرفیہ اپریل ۲۰۱۰ء کا سترہواں فقہی سیمینار پر مشتمل خصوصی شمارہ علم و فضل اور تحقیق و تدقیق کے گوہر لٹاتا ہوا فردوسِ نگاہ بنا۔ جریدہ اشرفیہ قلب و نظر کو طمانیت اور فکر کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ سیمینار کی رپورٹیں روزنامہ راشٹریہ سہارا کے توسط سے اسی وقت پڑھنے کو مل گئی تھیں۔ فقہی سیمینار کے فیصلے اور ان میں حل ہونے والے نو پید مسائل آپ کی صحافتی و ثقافتی سرگرمیوں اور میڈیا سے خصوصی دلچسپی کے باعث ملک و بیرونِ ملک میں استحسان کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ خیر اس کی ہی کیا تخصیص، جامعہ اشرفیہ ہر میدان میں نمایاں اور قابلِ فخر کارنامہ انجام دے رہا ہے۔

علما و مفتیانِ کرام کا "غیر رسم عربی میں قرآن حکیم کی کتابت" کی اجازت نہ دینا اور مسلکِ جمہور پر ثابت قدم رہنا انتہائی خوش آئند اور قابلِ تحسین عمل ہے۔ جلیل القدر صحابہ کا اس بات پر اجماع و اتفاق عہد عثمانی ہی میں ہو چکا ہے کہ عثمانی رسم الخط کی پیروی واجب اور اس کی مخالفت حرام ہے۔ کبار فقہا و علما، مفسرین و محدثین اور کاتبین کتابِ الٰہی اس کی پابندی کرتے آئے ہیں اور کتابتِ قرآن کے سلسلے میں بہت حزم و احتیاط سے کام لیا ہے، سوائے ان لوگوں کے جو جدت اور سہل پسندی کے نام پر مسلمانوں کو ان کے دینی ورثہ سے محروم کر دینا چاہتے ہیں، وہیں اس بدعتِ محرمہ کے موجد و مؤید ہیں۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ مجلس شرعی کے اس فیصلے اور فتوے کی جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ خوب تشہیر ہو، ناشرین کتب جو قرآن پاک کو ہندی، انگریزی وغیرہ رسم الخط میں چھاپ رہے ہیں، ان کے طباعتی اقدام کو روکنے کے لیے بھی مثبت جد و جہد ہونی چاہیے۔

مذکورہ عنوان پر مولانا ناصر حسین مصباحی کا مقالہ زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مقالہ نگار سے میری گزارش ہے کہ اس مقالہ کو کتابی شکل دے دیں، یہ ایک مثالی کارنامہ ہو گا۔ طلبائے اسلام اور شائقین فن تجوید و قراءت اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے اور اہل علم کے یہاں کتاب کی پذیرائی ہو گی اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ والسلام

محمد عرفان قادری، استاذ مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن، لکھنؤ

## اشرفیہ باطل قوتوں کے پرخچے اڑانے کی عظیم تحریک ہے

فخرِ صحافت علامہ مبارک حسین مصباحی صاحب قبلہ- تحیۃً و سلاماً

اس زمانے میں بہت سے رسائل شائع ہو رہے ہیں، لیکن

ان تمام رسالوں میں جو اہمیت ماہ نامہ اشرفیہ کو حاصل ہے وہ کسی رسالے کو حاصل نہیں۔ یہ رسالہ وقتِ آغاز سے لے کر آج تک بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور لوگوں کا اس پر مکمل اعتماد ہے کہ یہ باطل قوتوں کے پرخچے اڑانے کی عظیم تحریک ہے۔ آپ کے اداریے نہایت پرجوش اور قابل مطالعہ ہوتے ہیں، آپ کے اداریوں کی یہ خوبی ہے کہ قارئین کو اداریے پڑھ کر اور زیادہ دل چسپی پیدا ہوتی ہے اور وہ ماہ نامہ کے دیگر مضامین کو بڑی لگن سے مطالعہ کرتے ہیں اس کے دیگر مضامین بھی بڑے دل چسپ اور معتبر ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور دوبالا ہو جاتی ہے۔

حضرت عزیز ملت علامہ عبد الحفیظ صاحب قبلہ کی سرپرستی میں شائع ہونے والے اس رسالے نے ملک و بیرون ملک کے قارئین کو دلوں میں اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ اس کے نئے نئے کالم روز افزوں ترقی کے باعث بن رہے ہیں۔ یہ رسالہ الجامعۃ الاشرفیہ کا علمی شاہ کار اور ترجمان ہے جو ایک طویل زمانے سے دینی خدمت انجام دے رہا ہے۔ حضور حافظ ملت کا روحانی فیضان، آپ کے خونِ جگر سے سینچے گئے گلشن اور سنی مسلمانوں کے مرکز توجہ جامعہ اشرفیہ کی علمی سوغات بانٹ رہا ہے۔ محقق مسائل جدیدہ حضرت مفتی نظام الدین صاحب کے فقہی مسائل جو مسلمانوں کے جدید پیچیدہ اور سنگین مسائل کو مدلل طریقے سے حل کر رہے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اور آپ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، ان کے پاکیزہ دامن پر کیچڑ اچھالنے والوں کو ہر چہار جانب سے رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کسی رسالے میں آپ کے دامن پر دھبہ لگانے والوں کے دامن خود ہی داغ دار ہوتے ہیں۔ آپ اس ماہ نامہ کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے برابر کوشاں رہتے ہیں اور ایسے مضامین کی اشاعت سے برابر انحراف کرتے ہیں جو آپسی اختلاف کا باعث بنیں۔ باطل قوتوں کی جانب سے مذہب اسلام پر کیے گئے اعتراضات اور وہابی پروپیگنڈوں کا قلع قمع کرتا ہے۔ حضرت علامہ محمد احمد مصباحی اور نعمانی صاحب قبلہ کے مصلحانہ اور حکیمانہ مضامین ماہ نامہ کی روز افزوں ترقی میں معاون ثابت ہوں گے۔ ان بزرگ علما کی رہ نمائی اور آپ کی مفکرانہ سوچ اور اداریوں کی وجہ سے یہ رسالہ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ عصر حاضر کے سلگتے ہوئے مسائل کے بارے میں حتمی فیصلہ کے طور پر قارئین کی نذر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ماہ نامہ کی اشاعت میں دن دونی رات چوگنی کامیابی عطا فرمائے اور آپ کی عمر دراز کرے۔ آمین۔ فقط

محمد مسعود عالم مجیدی مصباحی، آستانہ مجیدیہ چاند اپور، کانپور

## کاروانِ اشرفیہ کے بڑھتے قدم

شہنشاہِ قرطاس و قلم مولانا مبارک حسین مصباحی - تسلیمات بیکراں

ماہ نامہ اشرفیہ اپریل ۲۰۱۰ء مطالعہ کی میز پر باصرہ نواز ہوا اور قلب و روح کو ایک نئی تازگی و تشفی دی اور ذہن و فکر کو تسکین میسر ہوئی اور کچھ گنجلک مسائل کا حل پا کر دل باغ باغ ہوا اور مزید یہ کہ جریدۂ اشرفیہ میں روز افزوں ترقی کے مینارے بلند ہوتے نظر آرہے ہیں۔ اس لیے کہ جریدۂ اشرفیہ مضامین سے لے کر تزئین کاری تک تمام اوصاف میں ایک اعلیٰ درجہ کی صفت کا متحمل نظر آتا ہے۔

جوں جوں اداریہ کو پڑھا تو ایسا محسوس ہوا کہ پورا سفر اندور نظروں کے سامنے ہو رہا ہے اور اس بیچ میں جو بھی علمی نکات سامنے آئے ان کو سلیس انداز میں قلم بند کر کے قارئین کے حوالے کیا اور اس کے بعد سیمینار میں ہوئے خطبات اور پیچیدہ مسائل اور ان کے جوابات کی کد و کاوش اور مسلسل جد و جہد اور عمل پیہم وافر تعداد میں موجود سامعین کے لیے ایک روح پرور منظر سے کم نہیں اور اہل اندور کی میزبانی لائق ستائش ہے اور اہل اندور کا یہ طرۂ امتیاز علمائے کرام کی قدر دانی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

مخصوص جریدۂ اشرفیہ کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کاروانِ اشرفیہ کبھی شہر اشرفیہ کے فلک شگاف مینار و گنبد میں ملی مسائل کے تحفظ کی خاطر مصروف و منہمک ہوتے ہیں تو کبھی والہانہ عقیدت رکھنے والے حضرات کے مدعو کرنے پر اہل سنت کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے پورے انہماک کے ساتھ وہاں ورودِ مسعود فرماتے ہیں اور ملت کو مشکل مسائل کا حل عطا فرماتے ہیں اور کارکنانِ اشرفیہ اس کو تسلسل کے ساتھ برقرار رکھنا بھی ملت کے مفاد کی سند پیش کرتے ہیں۔

باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ کاروانِ اشرفیہ کو عروج و ارتقا کی اعلیٰ منزلوں پر گام زن فرمائے اور خدمتِ خلق کرنے اور پیچیدہ امور کو جلد سے جلد پورا کرنے کا جذبۂ بے کراں عطا فرمائے۔ تمام شرکائے سیمینار کو دلی مبارک باد۔ فقط

وسیم اکرم نفیسی، جامعہ امجدیہ گھوسی، مئو



# خیر و خبر

## حضرت سراج الفقہا، ایوارڈ سے سرفراز

سراج الفقہا حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور کو بتاریخ ۱۴؍ اپریل ۲۰۱۰ء کو حضرت کی علمی فقہی، تصنیفی خدمات کے اعتراف میں مدرسہ قادریہ حیات العلوم شہزاد پور اکبر پور امبیڈکر نگر کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ایوارڈ عطا کیا گیا۔ حضرت کو یہ ایوارڈ درج ذیل علمی و دینی خدمات کے صلے میں عطا کیا گیا:

(۱)- آپ نے تقریباً ۳۵؍ کتب اور ۱۳۰؍ سے زائد علمی، فقہی، سماجی، تاریخی، اصلاحی مضامین قلم بند فرمائے ہیں۔

(۲)- ۱۴؍ جلدوں پر مشتمل آپ کے غیر مطبوعہ فتاویٰ ہیں۔

(۳)- جدید مسائل کی تحقیق اور فقہ اسلامی کی رو سے اس کا حل تلاش کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

حضرت کی زندگی کے یہ وہ عظیم کارنامے ہیں جس کا اعتراف اس سے پہلے صدر الشریعہ ایوارڈ، حافظی ایوارڈ، شبیہ نعلین شریفین اور قائد اہل سنت ایوارڈ و سراج الفقہا کا تکریمی خطاب دے کر مدارس و خانقاہوں نے مختلف اوقات میں کیا ہے۔

از: محمد فضل الرحمٰن برکاتی، پرانی بستی، مبارک پور، اعظم گڑھ

## جامعہ صمدیہ میں جشن ولادت رسول

۲۰؍ اپریل ۲۰۱۰ء بروز سہ شنبہ کو جامعہ صمدیہ پھپھوند شریف کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت کا جشن نہایت جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا، اس موقع پر ایک خصوصی پروگرام دن میں ۱۰؍ بجے سے ۱۲؍ بجے کے درمیان قصبہ پھپھوند شریف اور قرب و جوار کے غیر مسلم برادران وطن کے لیے منعقد ہوا، جس میں قرب و جوار کے غیر مسلم حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

اس موقع پر جامعہ صمدیہ کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا سید انور میاں نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ ہمارے اس پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کو اپنے غیر مسلم بھائیوں تک بھی پہنچائیں تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، انھیں دور کیا جا سکے۔

آج کے اس پروگرام میں خصوصی خطیب کی حیثیت سے خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں کے ولی عہد مولانا اسید الحق بدایونی اور شہزادۂ گرامی حضرت مولانا عطیف میاں قادری نے شرکت کی۔ مولانا عطیف قادری نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہندوستان میں سیکڑوں سالوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی لیکن پوری تاریخ میں کہیں بھی یہ نہیں ملتا کہ کبھی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فساد ہوا ہو۔ فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد ہی شروع ہوا۔

مولانا اسید الحق نے کہا: اگر اسلام کا رشتہ کسی بھی طرح دہشت گردی سے ہوتا تو دہشت گردی کا وجود آج سے چودہ سو سال پہلے ہی ہو جانا چاہیے تھا، کیوں کہ اسلام کوئی نو مولود مذہب نہیں بلکہ چودہ سو سال قدیم مذہب ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسلام دنیا میں نفرت پھیلانے نہیں بلکہ امن و امان کے لیے آیا ہے۔

پروگرام کے اخیر میں غیر مسلم مہمانوں نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے اور اس پروگرام کو ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک اہم اقدام قرار دیا۔ اس موقع پر غیر مسلم برادران کے لیے پیغمبر اسلام کی سیرت پر مشتمل ہندی زبان میں ایک کتابچہ شائع کیا گیا جو غیر مسلم مہمانوں کے درمیان تقسیم کیا گیا۔ ۲۰؍ اپریل کو شب میں ایک عظیم الشان جلسہ کا انعقاد ہوا جس میں مقرر خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر سید شمیم الدین منعمی نے شرکت کی جب کی دیگر خطبا میں مولانا عطیف قادری اور مولانا عبد القیوم جیت پور خاص طور سے شامل ہیں۔

پروفیسر منعمی صاحب نے عید میلاد النبی کے موضوع پر نہایت مدلل اور پر مغز خطاب فرمایا۔ اس اجلاس میں جامعہ صمدیہ کے شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی انفاس الحسن چشتی، مولانا اسید الحق بدایونی، آستانہ عالیہ صمدیہ پھپھوند شریف کے شہزادگان، جامعہ صمدیہ کے قابل قدر اساتذہ کے علاوہ قرب و جوار کے ہزاروں فرزندانِ توحید نے شرکت کی، جلسے کا اختتام پروفیسر منعمی صاحب کی دعاؤں اور صلاۃ و سلام پر ہوا۔

از: ساجد رضا مصباحی، استاذ جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف

## مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن میں جشن عید میلاد النبی

مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن، لکھنؤ میں مظاہرہ قراءت و جشن عید میلاد النبی کا عظیم الشان پروگرام ۲۲؍ اپریل ۲۰۱۰ء جمعرات کی

شت پٹیل پارک میں ہوا جس کی سرپرستی قاری تسلیم رضا قادری ہ بریلی شریف اور قاری محمد احمد بقائی مہتمم مدرسہ حنفیہ نے کی۔ اس موقع پر الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے استاذ مفتی عبد الحق رضوی مصباحی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ رسولِ اکرم ﷺ ہیں جن کو اللہ رب العزت نے اس دنیا میں مبعوث فرمایا تاکہ خیر کی حکمرانی ہو اور شر اس دنیا سے دور ہو جائے۔ اللہ کے رسول کی محبت مومن کے لیے ایک بہت بڑا ثمرہ ہے اور محبتِ نبوی کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

مولانا مختار الحسن قادری نے عظمتِ قرآن کے عنوان پر اپنے خطاب میں کہا کہ یہ الزام غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے، صحیح یہ ہے کہ اسلام قرآن کی فصاحت وبلاغت، جدت تراکیب، شوکت الفاظ اور اس کے محسنات لفظیہ ومعنویہ کی وجہ سے پھیلا ہے۔ حضرت عمر حضرت جبیر ابن مطعم، حضرت خلیل بن عمر الدوسی، نجاشی بادشاہ ضماد ابن ثعلبہ کا ایمان اس کی واضح مثال ہے۔ قاری محمد عرفان قادری نے اپنی افتتاحی تقریر میں تعلیم قرآن پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یورپ مسلمانوں سے نہیں بلکہ قرآن پاک کی تاثیر سے خوف زدہ ہے، اس لیے ہمیں ہر حال میں قرآن مجید سے رشتہ مضبوط رکھنا ہوگا۔ اس سے قبل اجلاس کا آغاز ظفیر احمد رضوی کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا، اشہر بہرائچی، قاری مطلوب منظر، قاری عبد الحنان فہمی نے نعت ومنقبت کے نذرانے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض مولانا مختر فریدی نے انجام دیے۔ مفتی حبیب اللہ نعیمی بلرام پور نے اپنے صدارتی خطاب میں مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن کی خدمات کو سراہا۔ مظاہرۂ قراءت کے اس روحانی اجلاس میں قاری خلق اللہ خلیق فیضی براؤں شریف، قاری شمس الدین قادری فیض آباد، قاری لئیق احمد اشرفی جگدیش پور، قاری محمد ایوب قادری گونڈہ، قاری احمد حسین ضیائی امبیڈکر نگر، قاری عبد الحی ضیائی رائے بریلی نے تجوید کی روشنی میں قراءت قرآن کا شاندار مظاہرہ کیا جنھیں پیر زادہ شیخ راشد علی مینائی بانی مینائی ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی درگاہ مخدوم شاہ مینا نے اعزازی طور پر گھڑی وشال اور پھولوں کا ہار پیش کیا۔ جب کہ مفتی محمد حبیب اللہ نعیمی دار العلوم فضل رحمانیہ کو اعلیٰ حضرت ایوارڈ اور رئیس القرا قاری رئیس احمد خان مہتمم دار العلوم نور الحق چرہ محمد پور فیض آباد کو قاری عبد الرحمٰن مکی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اجلاس کی قیادت شعبۂ قراءت کے سربراہ قاری ذاکر علی قادری نے کی۔ صلاۃ وسلام اور دعا پر جلسہ کا اختتام ہوا۔ قاری محمد احمد بقائی نے علما ومشائخ اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

از: محمد عرفان قادری، مدرسہ حنفیہ ضیاء القرآن، لکھنؤ

## مبارک پور میں جلسۂ سیرت النبی وجشن غوث اعظم

قصبہ مبارک پور (بھیلی بازار) میں سیدنا شاہ قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی مناسبت سے جلسہ سیرت النبی ﷺ وجشنِ غوثِ اعظم بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منایا گیا جس کی سرپرستی حضرت علامہ عبد الشکور مصباحی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ نے فرمائی۔ عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دینی بیداری کا ایک عجیب خوش نما منظر پیش کر رہا تھا۔ مفکر اسلام حضرت علامہ مبارک حسین مصباحی کا خطاب مرکزی حیثیت کا حامل رہا۔ آپ نے سیرت طیبہ اور جدید سائنس کے عنوان سے بڑی پر مغز اور فکر انگیز باتیں عوام کو بتائیں۔

آپ نے دورانِ تقریر کہا کہ "سائنس جس قدر ترقی کرتی جائے گی سیرت طیبہ کی اہمیت ومعنویت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا سیرت طیبہ کا مطالعہ تعصب کی عینک اتار کر کرے۔" نیز اولیاے کرام کے اختیارات وکمالات اور عرس کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ "آج خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ کا عرس پاک تقریباً آٹھ سو سالوں سے منعقد ہو رہا ہے جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ مروجہ عرس وفاتحہ اعلیٰ حضرت کے قلم یا حافظ ملت کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ قدیم معمولاتِ اہل سنت کے عین مطابق ہے، اسے شرک وبدعت قرار دینا سراسر ظلم اور بدعت ہے"۔

آپ نے فرمایا: "بزرگوں کے اعراس پیار محبت اور یک جہتی کا پیغام دیتے ہیں۔ بزرگوں کے اعراس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی عقیدت ومحبت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ جو لوگ اعراس کے مخالف ہیں وہ دراصل امن وآشتی اور یک جہتی کے مخالف ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جن کا تعلق القاعدہ، طالبان اور لشکر طیبہ وغیرہ دہشت گرد تنظیموں سے ہے نہ کہ اولیاے کرام سے۔

ان کے علاوہ جناب مولانا محمد ہاشم کانپوری، مولانا محتشم باللہ امبیڈکر نگر نے بھی خطاب فرمایا۔ صدارت مولانا نعیم اختر مبارک پوری اور نظامت مولانا رضوان نے فرمائی۔ صلاۃ وسلام اور دعا پر جلسے کا اختتام ہوا۔

از: محمد عمر دانش، جامعہ اشرفیہ مبارک پور

R.N.I. No: 29292/76 Regd. No.: AZM/N.P.28

# THE ASHRAFIA MONTHLY

Mubarakpur, Azamgarh (U.P.)-276 404 (INDIA) Phone: (05462) 250092, 250149, Fax : 251448
http://www.aljamiatulashrafia.org E-mail:info@aljamiatulashrafia.org June 2010